

مَدْرَاسِ  
حَافِظِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ مَدَنِي

فِی تِلْکِ اِسْلَامِیَّۃِ کَا عِلْمِی اَوْرَا صِلَاحِی عَمَلِہ

# مَحَدِّث

دسمبر ۲۰۰۸ء

- ۲ اسلامی نظریاتی کونسل کی حالیہ سفارشات
- ۵۰ تبلیغ دین کے لئے ٹی وی پروگرام؟
- ۴۵ 'عامدی صاحب: علماء کی نظر میں' کا جائزہ

مَجْلِسُ التَّحْقِیْقِ اِلِسْلَامِیِّ



# ماہنامہ محدث لاہور

## ماہنامہ 'محدث' لاہور کا اجمالی تعارف

مدیر اعلیٰ: حافظ عبدالرحمن مدنی      مدیر: ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

ماہنامہ 'محدث' لاہور، ہندوستان سے نکلنے والے ایک رسالے کی ہی ارتقائی شکل ہے۔ جامعہ رحمانیہ دہلی سے نکلنے والے رسالے - جس کا نام محدث تھا - کو پروان چڑھاتے ہوئے تقسیم ہند کے بعد دوبارہ ماہنامہ 'محدث' لاہور کے نام سے پاکستان میں معروف عالم دین و دانشور حافظ عبدالرحمن مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا اجراء کیا۔ یہ تحقیقی رسالہ ۱۹۷۰ء سے اب تک کامیابی و کامرانی سے شائع ہو رہا ہے، واللہ الحمد!

محدث کی علمی پہچان کے حوالے سے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ ہر صاحب علم و فضل کی ضرورت بن چکا ہے کیونکہ اس کے مضامین جدید فکر کے حامل اور لحدانہ افکار کیلئے شمشیر بے نیام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

## گھر بیٹھے 'محدث' وصول کیجئے!

قارئین کرام! گھر بیٹھے محدث حاصل کرنے کیلئے درج ذیل طریقہ کار اختیار کریں!

فنی شماره: ۲۰ روپے      زیر سالانہ: ۲۰۰ روپے      بیرون ملک: ۲۰ ڈالر

بذریعہ منی آرڈر / بینک ڈرافٹ ۲۰۰ روپے بھیج کر سال بھر گھر بیٹھے محدث وصول کریں اور علمی و تحقیقی

مضامین سے استفادہ کریں۔ ایڈریس: ماہنامہ محدث، ۹۹ جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۷۴۷۰۰

فون نمبر: 0305 - 4600861 / 042 - 3586639 / 35866476      موبائل: 0305 - 4600861

انٹرنیٹ پر محدث پڑھنے اور ڈاؤن لوڈ کرنے کیلئے درج ذیل ویب سائٹ دیکھئے!

www.kitabosunnat.com      www.mohaddis.com

مزید تفصیلات کیلئے: webmaster@kitabosunnat.com

## اجرائے محدث کے مقاصد

✍ عناد اور تعصب قوم کیلئے زہر ہلا بل کی حیثیت رکھتے ہیں!

لیکن تعصبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم اُمت کیلئے رحمت کا باعث ہے۔

✍ علوم جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں!

لیکن قدیم علوم اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دُقیانوس بنانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

✍ غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اُقدار کے منافی ہے!

لیکن دین اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا حمیت دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

✍ تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالِحِ دینیہ کے خلاف ہے!

لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رواداری برتنا اور قوانین و مسائلِ اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

✍ آئین و سیاست سے بیگانہ ہر کر عبادت کیلئے گوشہ نشین ہو جانازندگی سے فرار ہے!

لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔

✍ جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اوصاف میں داخل ہے!

لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

# ماہنامہ محدث لاہور

کا مطالعہ فرمائیے، آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزین پائیں گے، ان شاء اللہ!

کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔



مدرسہ اسلامی

ملتِ اسلامیہ کا علمی و اصلاحی مجلہ

مدیر

حافظ حسن مدنی

Only For SMS  
0333-4213525

ماہنامہ  
محدث  
پاکستان  
لاہور

حافظ حسن مدنی

جلد ۳۰ شماره ۱۲ — ذوالحجہ ۱۴۲۹ھ — دسمبر ۲۰۰۸ء

فہرست مضامین

فکر و نظر

اسلامی نظریاتی کونسل کی حالیہ سفارشات حافظ حسن مدنی ۲

حدیث و سنت

جاوید احمد غامدی اور انکارِ حدیث محمد رفیق چودھری ۲۹

مسئلہ تصویر

دینی مقاصد کیلئے الیکٹرونک میڈیا..... مولانا زاہد الراشدی ۳۰

دینی مقاصد کیلئے ٹی وی پروگراموں..... محمد اقبال کیلانی ۵۰

جب تصویر کی آفت نہ تھی! عمر فاروق سعیدی ۵۸

نعارف و نبطہ

نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود سعید احمد جلالپوری ۶۲

جاوید غامدی: علما کی نظر میں کا ایک جائزہ حافظ محمد زبیر ۷۵

• نمونہ سلف حافظ یحییٰ عزیز میر محمدی حکیم محمد یحییٰ عزیز ۸۹

• والدین کا مقام و مرتبہ اور فی زمانہ بے حس محبوب عالم فاروقی ۱۰۲

• ماہنامہ محدث کا یکسالہ موضوعاتی اشاریہ ۲۰۰۸ء محمد شفیق کوکب ۱۱۰

زر سالانہ

۲۰۰/=

فی شمار

۲۰/=

زر سالانہ

۲۰/=

فی شمار

۲/=

Monthly MUHADDIS A/c No: 984  
UBL - Model Town Crossing, Lahore

دفتر کاپیہ

۹۹

ماڈل ٹاؤن

لاہور 54700

☎ : 5866476

5866396

5839404

Email:

hhasan@wol.net.pk

Publisher:

Hafiz Abdul Rahman Madani

Printer:

Shirkat Printing Press, Lahore

Islamic Research Council

محدث کتاب و سنت کی روشنی میں آوازِ نبوت و تحقیق کا حامی ہے! راہِ کامیاب کا مضمون نگار حضرات سے کُل اتفاق ضروری نہیں!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فکر و نظر

## ’اسلامی نظریاتی کونسل‘ کی حالیہ سفارشات کا جائزہ

اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کا آئینی ادارہ ہے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں جب شق ۲۲۷ شامل کی گئی کہ پاکستان میں کوئی بھی قانون کتاب وسنت کے مخالف نہیں بنایا جائے گا تو عملاً اس کا باقاعدہ نظام وضع کرنے کی غرض سے اسی دستور میں ہی دفعہ نمبر ۲۲۸، ۲۲۹ اور ۲۳۰ میں ’اسلامی نظریاتی کونسل‘ کے نام سے ۲۰ افراد پر مشتمل ایک آئینی ادارہ بھی تشکیل دیا گیا جس کا مقصد صدر، گورنر یا اسمبلی کی اکثریت کی طرف سے بھیجے جانے والے معاملے کی اسلامی حیثیت کا جائزہ لے کر ۱۵ دن کے اندر اندر انہیں اپنی رپورٹ پیش کرنا تھا۔ شق نمبر ۲۲۸ میں یہ قرار دیا گیا کہ اس کے اراکین میں جہاں تمام فقہی مکاتب فکر کی مساوی نمائندگی ضروری ہوگی، وہاں اس کے کم از کم چار ارکان ایسے ہوں گے جنہوں نے اسلامی تعلیم و تحقیق میں کم و بیش ۱۵ برس صرف کئے ہوں اور انہیں عوام پاکستان کا اعتماد حاصل ہو۔ (شق ۲۲۸، ۷، سی)

اپنے یوم وجود سے لے کر آج تک کونسل نے متعدد اہم مسائل پر حکومت پاکستان کو شرعی رہنمائی اور تجاویز مہیا کی ہیں۔ کونسل کا ماضی اس حوالے سے بڑا تابناک رہا ہے کہ یہاں سے بالعموم کتاب وسنت کی ترجمانی اور قوم کو قیمتی سفارشات میسر آتی رہی ہیں اور عام مسلمانوں سے لے کر اہل علم و دین حضرات میں اس کی رائے کو قدر و وقعت سے دیکھا جاتا رہا ہے۔

مشرف حکومت نے جہاں وطن عزیز کو دیگر بہت سے سنگین مسائل سے دوچار کیا، وہاں اپنے مغربی افکار کی بدولت نظریاتی میدان میں بھی انہوں نے پاکستانی قوم کو تبدیل کرنے کی متعدد کوششیں کیں، جن میں تعلیم اور میڈیا میں اسلام مخالف اقدامات سرفہرست ہیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ مشرف حکومت کے آخری سالوں یعنی ۲۰۰۶ء کی آخری سہ ماہی میں پاکستان میں حدود قوانین کی ’مزعومہ اصلاح‘ کے لئے ایک بھرپور مہم چلائی گئی تھی، اور اس کو بعض ارباب



ابلاغ نے اس طرح پاکستانی قوم کے ذہن پر سوار کر دیا تھا کہ گویا اس دور کا سب سے سنگین ترین مسئلہ یہی سمجھا گیا جو بچے بچے کی زبان پر تھا۔ اس دور میں مختلف قومی حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جاتا رہا کہ حکومت کو چاہئے کہ اسلامی نظریاتی کونسل سے، جو اس بحث کا اصل علمی اور آئینی پلیٹ فارم ہے، اس سلسلے میں رہنمائی حاصل کرے۔ لیکن مارچ ۲۰۰۶ء و ما بعد ہونے والے کونسل کے متعدد اجلاسوں کے بعد کونسل میں ان قوانین کے خلاف اسلام ہونے پر اتفاق رائے پیدا نہیں ہو سکا تھا اور حکومت کی سر توڑ کوشش کے باوجود اُسے یہاں سے شرعی و اخلاقی تائید حاصل نہ ہو سکی تھی۔

انہی دنوں مشرف حکومت نے 'اسلامی نظریاتی کونسل' کی اس اسلام پسندی اور حکومت نوازی سے گریز پر قابو پانے کے لئے بعض 'روشن خیال' دانشوروں کو اس کونسل میں شامل کیا تاکہ اس کی رائے میں انتظامی طور پر تبدیلی لائی جاسکے۔ اس میں سب سے اہم تبدیلی تجدد پسند دانشور جاوید احمد غامدی کی بطور رکن نامزدگی تھی۔ حکومت کی اس دخل اندازی کا یہ نتیجہ تو برآمد ہوا کہ کونسل اپنے اسلامی تشخص سے محروم ہو کر اپنا سابقہ اعتماد و اعزاز کھو بیٹھی اور نظریاتی کونسل کے متعدد ممبران (مثلاً حاجی محمد حنیف طیب اور مظہر سعید کاظمی وغیرہ) نے اپنی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا، لیکن باضمیر ممبران نے مشرف حکومت کو یہاں سے حدود قوانین کی کلی تائید حاصل نہ ہونے دی۔

اراکین کونسل کے استعفیٰ کے دنوں میں اخلاقی برتری کے لئے جاوید احمد غامدی نے بھی کونسل کی رکنیت سے عین اسی طرح استعفیٰ دے دیا جیسے چوہدری شجاعت حسین نے پارلیمنٹ سے نمائشی استعفیٰ دیا تھا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ دیگر مخلص ممبران سے تو آج تک کونسل محروم چلی آرہی ہے، لیکن جاوید غامدی صاحب نہ صرف اسی شان و شوکت سے بلکہ اپنے دیگر حواریوں کے آنے کے بعد زیادہ آب و تاب سے وہاں براجمان ہیں۔ یاد رہے کہ کونسل کے موجودہ اراکین کی غالب اکثریت تجدد پسند دانشوروں پر مشتمل ہے مثلاً رشید جالندھری، ڈاکٹر منظور احمد، سید افضل حیدر اور سرفہرست جناب صدر نشین ڈاکٹر خالد مسعود صاحب۔

اس وقت کونسل میں ایک ہی شخصیت ہیں جنہیں معروف معنی میں عالم دین قرار دیا جاسکتا

ہے اور وہ ہیں جناب عبداللہ خلجی صاحب، جو گاہے بگاہے ان تجدد پرستوں کے درمیان اپنے اختلافات کا دَبے لفظوں میں اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اس بنا پر کونسل کی موجودہ ہیئت اس اعتبار سے خلافِ آئین بھی ہے کہ شق ۲۲۸/۱ء کی رو سے یہاں تمام مسلمہ مکاتب فکر کی نمائندگی موجود نہیں اور اس اعتبار سے بھی کہ شق ۲۲۸/۲ء کی رو سے کم از کم چار علمائے کرام ممبران میں سے فی الوقت صرف ایک شخصیت مولانا عبداللہ خلجی صاحب موجود ہیں۔

کونسل میں مذکورہ بالا حکومتی تبدیلی کا نتیجہ یہ نکلا کہ کونسل نے اپنے تابناک ماضی کے برعکس یوٹرن لیا۔ گزشتہ دو برس کی سفارشات کا ایک سرسری مطالعہ اس دعویٰ کی کافی دلیل ہے کہ غامدی صاحب کے آنے کے بعد کونسل ان کے منحرف آراء و افکار کا مرکز و محور بن گئی۔ وہ مباحث جو اس سے قبل غامدی صاحب کے مجلہ 'اشراق'، ان کی کتاب 'میزان' اور 'المورد' کی ویب سائٹ پر ملتی تھیں، بعد میں 'اسلامی نظریاتی کونسل' کے معتبر نام سے پیش ہونے لگیں۔ یوں تو کونسل کے موجودہ اراکین اپنے تفردات اور اسلام کے بارے میں عجوبہ روزگار خیالات کے حوالے سے پاکستان کے اہل علم حضرات میں پہلے بھی جانے پہچانے جاتے ہیں لیکن جاوید غامدی صاحب کی شکل میں انہیں ایسا نفسِ ناطقہ میسر آیا جو کتاب و سنت سے من چاہا استدلال کرنے اور ان سے اپنی بات کہلوانے کی جراتِ رندانہ کا حامل تھا۔ اس پر مستزاد جاوید غامدی کے مختلف ذرائعِ ابلاغ میں پھیلے ہوئے شاگرد<sup>☆</sup> ہیں جو کونسل کی غلط سفارشات کی ترجمانی اور تائید کے لئے ہر دم کمر بستہ رہتے ہیں۔ طبقہ علما میں سے صرف ایک شخصیت کی موجودگی اور مغرب نوازوں کی کثرت کے بعد کونسل کی سفارشات کو اسلام کی ترجمانی کی بجائے 'جدت پسندی' نہ سمجھا جائے تو کیا کہا جائے؟ اگر موجودہ کونسل کو اسلامی نظریاتی کونسل کی بجائے 'تجدد زدہ دانشوروں کا مرکز' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

غامدی صاحب کے منحرف افکار سے اس وقت بہت سے اہل علم بخوبی آگاہ ہیں۔ محدث میں ان کے افکار پر مضامین تسلسل سے شائع ہوتے رہے ہیں (جن میں ایک مضمون اس شمارہ میں

☆ بطور مثال حالیہ سفارشات کے حق میں غامدی صاحب کے شاگرد رشید خورشید ندیم کے روزنامہ 'جنگ' میں دو کالم اور روزنامہ پاکستان میں جناب افضال رحمان کا تین قسطوں پر مشتمل تفصیلی مضمون ملاحظہ کریں۔

بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے) اور ان کے افکار کے جو سنگین اثرات مسلم فکر و نظر پر سامنے آنا شروع ہوئے ہیں، اس سے ہر محبت دین شخص متفکر نظر آتا ہے۔ غامدی صاحب کی کاوشوں کا ایک مرکز تو ٹی وی سکرین ہے، جہاں وہ آئے روز دین کے نام پر نئے خیالات پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان کا دوسرا مرکز ’اسلامی نظریاتی کونسل‘ ہے۔ ایک معتمد آئینی ادارے کو انہوں نے اپنے غلط افکار کا زینہ بنا رکھا ہے، جہاں حکومتی وسائل بھی ان کے نظریات کے فروغ کے لئے صرف ہو رہے ہیں۔

اپنے ’نادر‘ افکار کو معاشرے میں پروان چڑھانے کے لئے موجودہ نظریاتی کونسل نے گزشتہ برس ایک اور خطرناک قدم یہ اٹھایا ہے کہ اپنی ۳۵ سالہ تاریخ کے برعکس، جب کہ کونسل کی تمام سفارشات حکومت کے لئے مخصوص ہوتی تھیں، ایک سلسلہ وار سہ ماہی مجلہ ’اجتہاد‘ کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔ اور مختصر مدت کے بعد مجالس بھی منعقد کرنا شروع کی ہیں۔ ’اجتہاد‘ کا تیسرا شمارہ ابھی حال میں شائع ہو کر سامنے آیا ہے۔ ہماری نظر میں اسلامی نظریاتی کونسل کا یہ مجلہ ’اجتہاد‘ متجدد دین کے افکار کا مرکز ہے جس کے ذریعے انہیں حکومتی اور آئینی پلیٹ فارم سے قوم میں اپنے نظریات پھیلانے کا سنہرا موقع ہاتھ آیا ہے۔

مجلہ ’اجتہاد‘ کے موضوعات و مشمولات کی ایک جھلک اور افکار پر ایک تبصرہ تو پھر کبھی سہی، سردست موجودہ نظریاتی کونسل نے جو نیا ’کارنامہ‘ انجام دیا ہے، اس نے ملک بھر کے علمی حلقوں میں شدید تشویش کی لہر دوڑا دی ہے اور پاکستان کے ممتاز علما نے ایک بار پھر شدت سے یہ مطالبہ دہرایا ہے کہ نظریاتی کونسل کو از سر نو تشکیل دیا جائے اور اس میں آئینی طور پر ماہرین شریعت کی مطلوبہ تعداد کو پورا کیا جائے، نیز تمام مکاتب فکر کو نمائندگی دی جائے۔ یاد رہے کہ کونسل اس وقت حدود قوانین کے حادثہ کے سبب محض ۹ ممبران پر ہی اکتفا کر رہی ہے، جبکہ ممبران کی کل تعداد ۲۰ تک ہے۔

## کونسل کی تازہ سفارشات کا متن

۱۵ نومبر بروز ہفتہ کو کونسل نے بعض عائلی مسائل پر چند نئی سفارشات منظور کی ہیں جن کے بارے میں ملک بھر کے دینی و عوامی حلقوں نے شدید احتجاج کیا ہے۔ پہلے وہ سفارشات



ملاحظہ فرمائیں، پھر علمائے پاکستان کا احتجاج اور آخر میں ان سفارشات پر ہمارا تبصرہ۔ یاد رہے کہ درج ذیل سفارشات کا متن اسلامی نظریاتی کونسل کی آفیشل ویب سائٹ سے ماخوذ ہے، اور اُردو ترجمہ بھی کونسل کا ہی جاری کردہ ہے:

- ① یہ قانون بنا دیا جائے کہ بیوی اگر کبھی تحریری طور پر طلاق کا مطالبہ کرے گی، تو شوہر ۹۰ دن کے اندر اُسے طلاق دینے کا پابند ہوگا۔ وہ اگر ایسا نہیں کرے گا تو یہ مدت گزر جانے کے بعد طلاق واقع ہو جائے گی، الا یہ کہ بیوی اپنا مطالبہ واپس لے لے۔ اس کے بعد شوہر کے لیے رجوع کا حق نہیں ہوگا اور بیوی پابند ہوگی کہ مہر اور نان نفقہ کے علاوہ اگر کوئی اموال و املاک شوہر نے اسے دے رکھے ہیں اور اس موقع پر وہ انہیں واپس لینا چاہتا ہے، تو فصل نزاع کیلئے عدالت سے رجوع کرے یا اس کا مال اسے واپس کر دے۔
- ② طلاق کے مؤثر ہو جانے کے بعد مطلقہ عورتیں اگر چاہیں تو عدالت شوہر کے معاشی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے لیے قرآن کے مطابق عطا کردہ حق متاع کی مقدار متعین کرنے کا حکم صادر کر سکتی ہے، جو یک مشمت بھی ہو سکتی ہے اور ماہ بہ ماہ بھی، جب تک مطلقہ عورت کی اگلی شادی نہ ہو جائے۔

- ③ طلاق کی رجسٹریشن کے نظام کو مؤثر بنایا جائے اور اس کی رجسٹریشن بھی اسی طرح ہونی چاہیے جس طرح نکاح کی رجسٹریشن ہوتی ہے۔

- ④ مجوزہ طلاق نامہ فارم پر غور کرتے ہوئے کونسل نے فیصلہ کیا کہ اس مجوزہ فارم کے ساتھ ایک تعارفی پیرا گراف بھی دیا جائے کہ طلاق کی رجسٹریشن نہ ہونے کی وجہ سے جو مفاسد پیدا ہو رہے ہیں، ان کی وجہ سے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ نکاح نامہ کی طرز پر ایک طلاق نامہ فارم بھی تجویز کیا جائے۔

- ⑤ مہر عورت کا حق ہے، اسے کسی حالت میں بھی چھوڑا نہیں جاسکتا۔ تاہم عدالت اگر چاہے تو تحائف اور فوائد کے سلسلے میں مصالحت کر سکتی ہے۔ کونسل نے عائلی عدالتوں کے قانون مجریہ ۱۹۶۲ء کی دفعہ ۱۰ کی ذیلی دفعہ ۴ میں لفظ حق مہر کو شادی کے عوض دیئے گئے تحائف اور فوائد سے تبدیل کرنے کی تجویز سے اتفاق کیا اور اسے قانون کا حصہ بنانے کی سفارش کی۔

- ⑥ کونسل نے محرم کے بغیر خواتین کے سفر حج کے بارے میں فیصلہ دیا۔ دستور پاکستان اور دیگر ملکی قوانین کے تحت خواتین آزادی سے اندرون ملک اور بیرون ملک سفر کر سکتی ہیں۔ اسپر کوئی قدغن نہیں ہے۔ سعودی عرب کے قوانین کونسل کے دائرہ اختیار میں نہیں آتے۔
- ⑦ خالص سائنسی طریقے سے مکہ مکرمہ کو مرکز بنا کر چاند کی ولادت کے لحاظ سے پوری دنیا کے لیے ایک بحری کیلنڈر بنا دیا جائے اور تمام مذہبی تہوار اس کے مطابق منائے جائیں۔
- ⑧ کونسل نے ملک میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی اور انتہا پسندانہ رجحانات کے پیش نظر ایک خصوصی رپورٹ شائع کرنے کا فیصلہ کیا جس کی روشنی میں حکومت کو دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے سفارشات پیش کی جائیں گی۔ اس سلسلے میں کونسل نے اس بات پر بھی توجہ دی ہے کہ دہشت گردی کی صورت میں ایک عام آدمی کو کیا کرنا چاہیے؟
- ⑨ کونسل نے نادار اقربا کی کفالت کے لیے قانون سازی کی سفارش کی اور اس کے لیے اپنے تیار کردہ آرڈیننس برائے نادار اقربا کے مسودے کو حکومت کے سامنے دوبارہ پیش کرنے کی سفارش کی۔ کونسل نے نفاذ شریعت کے حوالے سے کچھ رہنما اصول منظور کیے ہیں جنہیں نفاذ شریعت پر ہونے والی آئندہ کانفرنسوں میں علما کرام کے سامنے رکھا جائیگا۔ یہ تو تھا کونسل کے ۱۷ ویں اجلاس کی سفارشات کا مکمل متن جس کے اہم نکات کو روزنامہ 'جنگ' نے اگلے روز یعنی ۱۶ نومبر ۲۰۰۸ء کو کونسل کے چیئرمین کی زبانی یوں رپورٹ کیا:
- ”شوہر کو تحریری طلاق کا مطالبہ کرنے والی بیوی کو ۹۰ روز کے اندر طلاق دینے کا قانونی پابند بنایا جائے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں معینہ مدت کے بعد نکاح فسخ قرار پائے گا۔ کونسل نے نکاح نامے کی طرح طلاق نامہ بھی تجویز کیا ہے اور حکومت سے کہا ہے کہ نکاح کی طرح طلاق کی رجسٹریشن بھی کی جائے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا اجلاس ہفتے کو کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود کی صدارت میں ہوا جس میں کونسل نے رویت ہلال کے مسئلے کو غیر متنازع بنانے کے حوالے سے تجویز کیا ہے کہ مکہ مکرمہ کو مرکز بنا کر تمام مذہبی تہوار اسی کے مطابق منائے جائیں۔ گزشتہ دنوں ڈاکٹر خالد مسعود نے صدر مملکت سے ملاقات میں کونسل کی سفارشات پر قانون سازی کی طرف توجہ مبذول کروائی تو انہوں نے پارلیمانی امور کے وفاقی وزیر ڈاکٹر بابر اعوان کی سربراہی میں کونسل کی رپورٹوں کے جائزے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دے دی

ہے۔ کونسل کے تمام اراکین نے صدر کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے اس اُمید کا اظہار کیا کہ اب کونسل کی سفارشات کو بہت جلد بحث کے لئے پیش کیا جاسکے گا۔“

### پاکستان کے ممتاز و معتمد علمائے کرام کا شدید احتجاج

① کونسل کی ان تجاویز کو اخبارات میں شائع ہوئے ابھی ہفتہ بھی نہیں گزرا کہ اس بارے میں ہر مکتب فکر کا شدید احتجاج سامنے آیا ہے۔ پاکستان کے جید اہل علم اور ممتاز دینی ادارے ان کی مخالفت میں یک زبان ہیں۔ ان سفارشات کے غلط ہونے میں کہیں دورائے موجود نہیں اور انہیں شریعت میں کھلم کھلا تحریف قرار دیا جا رہا ہے، مثلاً:

”اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین شریعت میں تحریف کی کوششوں سے باز رہیں۔ ان خیالات کا اظہار عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت اور جامعہ علوم اسلامیہ، بنوری ٹاؤن کے رہنماؤں نے کراچی دفتر میں منعقدہ ایک اجلاس میں کیا۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے نائب امیر اور جامعہ علوم اسلامیہ کے رئیس ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، نائب مدیر سید سلیمان یوسف بنوری، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کراچی کے امیر مولانا سعید احمد جلال پوری، مولانا امداد اللہ اور مفتی عبد المجید دین پوری نے اجلاس میں موجود شرکا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین خالد مسعود دین و شریعت اور منصوصات اسلام میں تحریف و تنسیخ سے باز رہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ شریعت اور احکام شریعت آج سے ۱۴ سو سال قبل آنحضرت ﷺ نے مقرر فرمادیئے ہیں جو قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔

انہوں نے کہا کہ اسلام اور شریعت میں ہر دور اور طبقے کے لئے احکامات موجود ہیں، اس میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ کا مشورہ دینا مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کے مترادف ہے۔

انہوں نے حکومت سے پر زور مطالبہ کیا کہ مغرب زدہ ان نام نہاد اسکالروں کو اس اہم منصب سے برطرف کیا جائے اور ان کی جگہ مستند علمائے کرام کو اس منصب پر فائز کیا جائے۔ اجلاس سے متعدد اہل علم اور دینی شخصیات نے خطاب کرتے ہوئے اس سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار کیا۔“ (روزنامہ جنگ: ۲۰ نومبر)

② کونسل کی ان سفارشات کے بعد مختلف اہل علم حضرات کا مطالبہ متفقہ طور پر سامنے آیا ہے کہ نظریاتی کونسل کی تشکیل جدید کی جائے، ورنہ ملکی سطح پر احتجاجی تحریک چلائی جائے گی۔ موجودہ اراکین اس قابل نہیں ہیں کہ وہ اسلام کی ترجمانی کا اہم فریضہ انجام دے سکیں۔ ان

سفارشات کے بعد بے چینی اس قدر پھیل گئی کہ 'جیو ٹی وی چینل' نے اپنے پروگرام 'عالم آن لائن' میں ملک بھر کے ممتاز علما کو مدعو کر کے ان سے مختلف سوالات کئے، جن کے جواب میں ”ممتاز عالم دین اور مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان کے چیئرمین پروفیسر مفتی منیب الرحمن نے صدر مملکت آصف علی زرداری کو متنبہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ حکومت نے اگر اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو اہمیت دیتے ہوئے انہیں نافذ کرنے کی کوشش کی تو علما پورے ملک میں بھرپور تحریک چلائیں گے اور شریعت کے تحفظ کے لئے ہر آئینی، قانونی اور اخلاقی اقدام بلا کسی تامل اٹھائیں گے۔ جیو کے معروف پروگرام 'عالم آن لائن' میں اسلامی نظریاتی کونسل کی متنازعہ سفارشات پر ممتاز اسکالر ڈاکٹر عامر لیاقت حسین کے مختلف سوالات کے جوابات دیتے ہوئے انہوں نے مطالبہ کیا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کو فی الفور تحلیل کیا جائے اور اسلام کو سمجھنے اور اس کی تعلیم دینے والوں کو اس اہم آئینی ادارے کا رکن بنایا جائے۔

انہوں نے زور دیکر کہا کہ موجودہ اسلامی نظریاتی کونسل دراصل پرویز مشرف کا لگایا ہوا پودا ہے اور اس کی سفارشات سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک متوازی شریعت قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اگر حکومت نے بروقت اس کا توڑ نہ کیا تو باجوڑ اور مالاکنڈ میں اٹھنے والی لہر پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

'جامعہ بنوریہ العالمی' کے مہتمم اور ممتاز عالم دین مفتی محمد نعیم نے کہا کہ اسلامی امور میں پی ایچ ڈی کرنے والے ہر شخص کے بارے میں یہ تصور کر لینا کہ وہ اسلامی امور کا بھی ماہر ہے، صریحاً غلط ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی نظریاتی کونسل میں شامل تمام افراد نا اہل ہیں جن کا کام صرف تنخواہیں لینا اور مراعات حاصل کرنا ہے، انہیں نہ دین کی سمجھ ہے، نہ دنیا کی۔

جمعیت علمائے اسلام کے رہنما مولانا اسعد تھانوی نے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو براہ راست شریعت سے متصادم قرار دیتے ہوئے اسے ایک انتہائی غیر معقول اقدام قرار دیا۔ 'جمعیت اہل حدیث پاکستان' کے سربراہ پروفیسر ساجد میر نے کہا کہ مجھ سے اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک رکن نے کہا کہ ہم نے ایسی کوئی سفارشات پیش نہیں کی ہیں اور میڈیا والے یونہی بات کا ہتکڑ بنا دیتے ہیں لیکن وہیں پر موجود اسلامی نظریاتی کونسل میں کام کرنے والی ایک اہم شخصیت نے کہا کہ موصوف جھوٹ بول رہے ہیں، یہ سارا کیا دھرا ان ہی کا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں کسی کا نام نہیں لینا چاہتا مگر جب اراکین ہی اتنے جھوٹے ہوں تو

سفارشات کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے مستعفی رکن اور مقامی ہسپتال میں زیر علاج حاجی محمد حنیف طیب نے ٹیلیفون پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ میں نے استعفیٰ ہی دراصل اسی لئے دیا تھا کیونکہ اسلامی نظریاتی کونسل کا ایجنڈا نیک نہیں تھا اور میرے ساتھ موجودہ وفاقی وزیر حامد سعید کاظمی کے بڑے بھائی مظہر سعید کاظمی بھی ان ہی وجوہات کی بنا پر مستعفی ہوئے تھے۔

پروگرام کے میزبان ڈاکٹر عامر لیاقت حسین نے پروگرام کے دوران کئی مرتبہ اسلامی نظریاتی کونسل کا موقف جاننے کی کوشش کی، تاہم چیئر مین کے سیکرٹری نے یہ کہہ کر بات کرانے سے انکار کر دیا کہ وہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتے، ان کا کام سفارشات پیش کرنا تھا اب یہ پارلیمنٹ کا کام ہے کہ وہ اسے منظور کرے یا رد، وہ فی الحال کوئی تبصرہ نہیں کر سکتے۔ اس موقع پر بعض دیگر اراکین سے بھی رابطے کی کوشش کی گئی، تاہم کوئی بھی ان سفارشات کا دفاع کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔“ (روزنامہ جنگ: ۲۰ نومبر)

③ جماعت اسلامی پاکستان نے ان سفارشات پر اپنا رد عمل ان الفاظ میں پیش کیا:

”ممتاز دینی و سیاسی رہنماؤں نے اسلامی نظریاتی کونسل کی جاری کردہ سفارشات کو شرعی احکام کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے اسے رد کر دیا ہے اور کہا ہے کہ نکاح اور طلاق کے احکام اور قواعد و ضوابط طے شدہ ہیں، انہیں مغربی تہذیب اور کلچر کو رواج دینے کے لیے ختم یا ان میں مجوزہ قسم کی ترمیم کرنے کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہے۔ موجودہ اسلامی نظریاتی کونسل اپنے مینڈیٹ سے تجاوز کرتے ہوئے شرعی احکام میں ترمیم کر رہی ہے۔ امیر جماعت اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد، نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان چوہدری محمد اسلم سیلی ایڈووکیٹ، اسد اللہ بھٹو امیر جماعت اسلامی سندھ، حافظ محمد ادیس ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی لاہور، شیخ القرآن والحديث مولانا عبدالمالک صدر جمعیت اتحاد العلماء پاکستان، مولانا عبدالحلیم نقشبندی صدر جمعیت اتحاد العلماء پنجاب، مولانا عبدالرؤف صدر جمعیت اتحاد العلماء کراچی، شیخ الحدیث آغا محمد منصورہ سندھ، مولانا سید محمود فاروقی اور شیخ الحدیث دارالسلام گزری نے اپنے ایک مشترکہ بیان میں کہا کہ عورت کی تحریری درخواست پر اس کے کیس کی سماعت ہو سکتی ہے اور عدالت شرعی احکام کی روشنی میں فیصلہ کر سکتی ہے لیکن ایسی قانون سازی نہیں کی جاسکتی جس میں محض عورت کی تحریری درخواست پر شوہر کو طلاق کا پابند کر دیا جائے اور اس کے لیے

مدت مقرر کردی جائے۔ عورت مظلوم ہو، طلاق کی حقدار ہو تو عدالت ہر کیس کی نوعیت کو دیکھ کر فیصلہ دے گی۔ شوہر ظالم نہ ہو، عورت کے حقوق ادا کرتا ہو تو عورت کی درخواست خارج کر دی جائے گی اور مصالحت کرائی جائے گی۔ اسی طرح طلاق کی رجسٹریشن بھی غیر شرعی ہے، زبانی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ قرآن و سنت اور اجماع اُمت اس پر گواہ ہے۔ آج تک زبانی طلاق ہی نافذ ہوتی رہی ہے۔ محرم یا عورتوں کی جماعت کا تحفظ سفر کے لیے ضروری ہے۔ اگر دستور پاکستان نے کوئی پابندی عائد نہیں کی تو یہ ایک خلا ہے۔ اس خلا کو جت بنا کر شرعی حکم کو ختم نہیں کیا جاسکتا بلکہ خلا کو شریعت کے مطابق پر کیا جائے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی ان سفارشات کو ہم مسترد کرتے ہیں اور اس پر شدید احتجاج کرتے ہیں۔“ (۱۶ نومبر)

② ملک کی معروف دینی درسگاہ دارالعلوم کراچی نے ان سفارشات پر اپنا موقف پیش کرتے ہوئے قرار دیا:

”جامعہ دارالعلوم کراچی کے صدر مفتی رفیع عثمانی، نائب صدر مفتی تقی عثمانی، مفتی محمود اشرف، مفتی عزیز الرحمن اور مفتی عبدالرؤف سکھروی نے اپنے مشترکہ بیان میں مطالبہ کیا ہے کہ دستور کے تقاضوں کے مطابق معتمد علمائے دین پر مشتمل نئی اسلامی نظریاتی کونسل تشکیل دی جائے اور اُمت کو انتشار سے بچانے اور فتنے سے محفوظ رکھا جائے۔ اُنہوں نے کہا کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے جبری طلاق اور بغیر محرم کے حج کرنے سے متعلق جو سفارشات پیش کی ہیں وہ علم دین سے واقفیت رکھنے والے ہر شخص کے لئے حیرتاک، قابل مذمت اور فتنہ انگیز ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی موجودہ ہیئت نہ دستور کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور نہ ہی اس کو عوام اور اہل علم کا اعتماد حاصل ہے۔ سابق صدر پرویز مشرف نے اپنی نام نہاد روشن خیالی کے نام پر اس کی تشکیل دی تھی اور اس وقت ارکان کی تعداد کے لحاظ سے بھی وہ نامکمل ہے اور مستند و معتمد علمائے دین میں سے کوئی بھی اس کی رکنیت میں شامل نہیں ہے۔“ (روزنامہ جنگ: ۲۱ نومبر)

③ کونسل کی مذکورہ بالا سفارشات آنے کے بعد مختلف علمائے کرام اور دینی تنظیموں نے اس سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار کیا، قومی اخبارات احتجاج سے بھرے پڑے ہیں۔ علما کے اس شدید احتجاج کی تائید کرتے ہوئے وفاقی وزیر مذہبی امور نے بھی اطمینان دلایا اور یہ قرار دیا کہ کونسل کی ان سفارشات کی موجودہ حالت میں کبھی توثیق نہیں کی جائے گی:

”حکومت اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر نظر ثانی کرائے گی جو ایک نامکمل کونسل نے



جاری کی ہیں، موجودہ کونسل میں ۸ ارکان ہیں جبکہ اس کی کل تعداد ۲۰ ہے۔ تمام مکاتب فکر کے ممتاز علما کو شامل کرنے کے بعد سفارشات پر نظر ثانی کی جائے گی۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی حالیہ سفارشات کی موجودہ حالت میں توثیق نہیں کی جائے گی۔ وفاقی وزیر مذہبی امور علامہ حامد سعید کاظمی نے یہ یقین دہانی منگل کے روز قومی اسمبلی میں نکتہ اعتراض پر جواب دیتے ہوئے کرائی ہے۔ قبل ازیں اپوزیشن کی طرف سے صاحبزادہ فضل کریم نے نکتہ اعتراض پر معاملہ اٹھایا تھا۔ انہوں نے اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے حال ہی میں جاری کی گئی سفارشات کو غیر شرعی قرار دیا اور کہا کہ یہ سفارشات موجودہ حکومت کے خلاف سازش ہے۔

حکومت کی طرف سے وفاقی وزیر مذہبی امور غلام حامد سعید کاظمی نے ایوان میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات باضابطہ طور پر ارسال نہیں کی گئی ہیں، اسلامی نظریاتی کونسل کے ارکان کی کل تعداد ۲۰ ہے، سابق حکومت نے ۸ ارکان سے ہی کام چلایا ہے، ہماری حکومت باقی ارکان کی نامزدگی کرے گی جس میں ممتاز علما کرام شامل ہوں گے جن کا تمام مکتبہ ہائے فکر سے تعلق ہوگا، اس کے بعد ان سفارشات پر نظر ثانی کی جائے گی۔ تب قانون سازی کا مرحلہ آئے گا، ان سفارشات کی موجودہ حالت میں توثیق نہیں کی جائے گی۔

وفاقی وزیر قانون فاروق نائیک نے موقف اختیار کیا کہ سفارشات وزارت کو موصول نہیں ہوئی ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر علما کرام نے جو تحفظات کا اظہار کیا ہے، وہ جلد بازی میں کیا جا رہا ہے، کونسل کی سفارشات پر قانون سازی قومی اسمبلی کا معاملہ ہے۔ جب سفارشات ایوان میں پیش کی جائیں گی تب ارکان اسمبلی اس میں ترامیم پیش کر سکتے ہیں۔ انہوں نے یقین دہانی کرائی کہ خلاف اسلام کوئی قانون سازی نہیں ہوگی۔ وفاقی وزیر پارلیمانی امور ڈاکٹر ابرار اعوان نے کہا کہ پیپلز پارٹی نے ایسی کوئی سفارشات تیار نہیں کرائی ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے سفارشات تیار کر کے ایوان صدر بھجوائی ہے جس کا جائزہ لینے کے لئے کمیٹی بنائی گئی ہے جس کی سربراہی ان کے پاس ہے۔ ادھر ایک بیان کے مطابق مرکزی جمعیت علمائے پاکستان کے مرکزی صدر فضل کریم نے کہا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین نے اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مرکزی حکومت کو جو سفارشات عورت کے طلاق کے سلسلے میں پیش کیں وہ غیر شرعی ہیں اور عوام اہلسنت، ارکان مرکزی جمعیت علمائے پاکستان مذکورہ چیئرمین کے خلاف قانونی اور سیاسی اقدامات کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔“

(روزنامہ جنگ: ۱۹ نومبر)

## علمائے کرام کے احتجاج کی وضاحت

علمائے کرام کے اس شدید احتجاج کے جواب میں کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود کو بھی دفاعی انداز اختیار کرتے ہی بنی اور انہوں نے یہ جواز پیش کیا کہ انہوں نے قانون سازی کے لئے پارلیمنٹ کو صرف سفارشات دی ہیں، کوئی فتویٰ جاری نہیں کیا، البتہ اپنے موقف کی تائید میں انہوں نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ

”نئی سفارشات کا مقصد عورت کو طلاق کا حق دینا نہیں بلکہ خلع کے قانون کو آسان بنانا اور طلاق کی رجسٹریشن کو لازمی بنا کر کئی قانونی پیچیدگیوں سے بچنا ہے۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے گزشتہ روز ’آن لائن‘ کو دیئے گئے خصوصی انٹرویو میں کیا۔ چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل نے کہا کہ کونسل نے ڈیڑھ سال کی تحقیق اور تمام ممالک کے اسلامی قوانین کا جائزہ لینے کے بعد طلاق کی رجسٹریشن اور عورت کی طرف سے طلاق کے تحریری مطالبے پر تین ماہ میں خود بخود طلاق واقع ہو جانے کے لئے قانون کی سفارش کی ہے۔ اس سلسلے میں کونسل کے نومبر ان میں سے آٹھ نے اس کی حمایت کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان سفارشات کا مقصد عورت کو طلاق کا حق دینا نہیں بلکہ خلع کے قانون کو آسان بنانا اور طلاق کی رجسٹریشن کو لازمی بنا کر کئی قانونی پیچیدگیوں سے بچنا ہے۔ ڈاکٹر خالد مسعود نے کہا کہ ان سفارشات کے بعد کچھ علمائے کرام اور مذہبی تنظیموں کی طرف سے میری ذات اور کونسل کے خلاف تنقید کا ایک طوفان اٹھایا جا رہا ہے۔ کونسل نے اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں کیا بلکہ اپنی آئینی حدود میں رہتے ہوئے مکمل تحقیق کے بعد طلاق جیسے حساس مسئلے پر حکومت کو قانون سازی کے لئے سفارشات پیش کی ہیں، کوئی فتویٰ جاری نہیں کیا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین نے کہا کہ اسلام نے عورتوں کو مکمل حقوق فراہم کئے ہیں اور اگر کوئی عورت اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو اسے علیحدگی اختیار کرنے اور طلاق لینے کا حق حاصل ہے۔ اگر عورت اپنا مہر چھوڑ دے یا اس سے کچھ کم یا زیادہ مال شوہر کو دے کر طلاق طلب کرے تو شوہر طلاق دینے کا پابند ہے جبکہ طلاق کو رجسٹر کرنے سے کئی قانونی پیچیدگیوں سے بچا جاسکتا ہے۔“ (جنگ: ۲۱ نومبر)

معاملہ کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے ۲۵ نومبر بروز پیر کو حکومت نے اس سلسلے میں ایک اہم اجلاس طلب کیا جس میں وفاقی وزیر قانون نے کہا کہ اسلام میں عورت کو طلاق کا حق حاصل ہے، لیکن ہم کونسل کی سفارشات کا سختی سے جائزہ لیں گے:

”حکومت ملک میں خواتین کے تحفظ، بچوں کی کفالت اور ان کی حفاظت سمیت خواتین کے حقوق کی بہتری کے لئے قانون سازی کرنا چاہتی ہے لیکن یہ تمام قانون سازی قرآن و سنت کے مطابق اور اس کے دائرہ کے اندر ہوگی اور جہاں ضرورت پڑے گی، ہم دیگر علمائے کرام سے بھی مشاورت کریں گے۔ پیر کو وزارتِ قانون و انصاف میں منعقدہ اجلاس کے بعد صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے وزیر قانون نے کہا کہ اسلامی نظریاتی کونسل سے طلاق اور دیگر سفارشات کی تفصیل طلب کی ہے تاکہ آئین کے تحت ان کا جائزہ لیا جاسکے۔ انہوں نے کہا کہ مسلم پرسنل لا کے حوالہ سے غور کیا گیا اور اس میں طلاق، نان نفقہ اور بچے کی تحویل سے متعلقہ امور پر گفتگو ہوئی۔

آئین کی شق ۲۲ کے تحت لازم ہے کہ تمام قوانین کو اس دستوری شق کے تحت دیکھا جائے کیونکہ قرآن و سنت سے متصادم کوئی قانون ملک میں نہیں بن سکتا۔ طلاق کے مؤثر ہونے کے موضوع پر خاصا تبادلہ خیال ہوا۔ اجلاس میں اس سوال پر بھی غور ہوا کہ طلاق کے بعد کیا عورت کا شوہر کی جائیداد میں حق ہو سکتا ہے یا نہیں؟ طلاق کے بعد بچوں کو نان نفقہ دینے کا معاملہ بھی زیر غور آیا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود نے اجلاس کو بتایا کہ آئندہ اجلاس میں قرآن و سنت کے تحت تجاویز پیش کریں گے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے فیصلوں کی پارلیمان پر پابندی کے حوالہ سے سوال پر وفاقی وزیر قانون نے کہا کہ آئین کے آرٹیکل ۲۳۰ کے تحت اسلامی نظریاتی کونسل کے کام کے حوالہ سے صراحت موجود ہے۔ آئین کے تحت اسلامی نظریاتی کونسل کے کم از کم ارکان کی تعداد ۸ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰ ہے، اس وقت کونسل کے ارکان کی تعداد ۱۰ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کونسل کی تشکیل درست ہے۔ کونسل کا کام سفارشات مرتب کرنا اور یہ جائزہ لینا ہے کہ قوانین قرآن و سنت کے منافی تو نہیں۔ یہ سفارشات تجویز کی حد تک ہیں، رپورٹ پارلیمان میں پیش کی جاتی ہے جس پر پارلیمان کو ۲ سال کی مدت میں قانون سازی کرنا ہوتی ہے۔ ایک سوال پر انہوں نے کہا کہ عورت مرد سے علیحدگی (خلع) مانگ سکتی ہے۔ ایک خاتون کو ویسٹ پاکستان فیملی کورٹ ایکٹ ۱۹۵۴ء کے تحت فیملی عدالت میں درخواست دینا ہوتی ہے جس کے تحت عدالت اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود کے اندر خاتون کے مرد کے ساتھ گزر اوقات نہ ہونے کی صورت میں اسے خلع طلاق کی اجازت دیتی ہے۔

اسلام نے واضح طور پر عورت کو طلاق کا حق دے رکھا ہے جسے طلاق تفویض قرار دیا جاتا ہے، نکاح نامے کے اندر بھی یہ شق نمبر ۱۸ موجود ہوتی ہے جس کے تحت عورت کو مرد کی جانب سے طلاق کا حق دینے اور اس کی شرائط کا ذکر موجود ہے۔ اجلاس میں اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود اور دیگر اعلیٰ حکام نے شرکت کی۔“ (۲۵/نومبر)

### کونسل کی سفارشات کا شرعی جائزہ

کونسل کی سفارشات پیچھے گزر چکی ہیں، جن پر مختلف دینی رہنماؤں اور جماعتوں کا تبصرہ بھی آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ نظریاتی کونسل کی ان سفارشات کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس کے ایک جائزے سے قبل یہ واضح رہنا چاہئے کہ کونسل کی زیر نظر سفارشات مشہور منکر حدیث غلام احمد پرویز کے نظریات بالخصوص نظریہ مرکز ملت سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت وقت کو شریعت میں ترمیم و منیخ کرنے کا حق حاصل ہے۔

☆ چنانچہ منکر حدیث غلام احمد پرویز کے نزدیک شریعت کی انوکھی تعریف ملاحظہ فرمائیے: ”اس قرآن کے اصول محکم اساس پر مبنی ہیں جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان اصولوں کی جزئیات مختلف حالات کے تقاضوں کے ساتھ ادنیٰ بدلتی رہتی ہیں۔ ان بدلنے والی جزئیات کو شریعت کہا جاتا ہے۔“ (طلوع اسلام: اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۲۶)

”قرآن میں جہاں اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد امام وقت یعنی مرکز ملت کی اطاعت ہے۔ جب تک رسول اللہ اُمت میں موجود تھے، ان کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت تھی، اور آپ کے بعد آپ کے زندہ جانشینوں (مسلم حکمرانوں) کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہوگی۔“ (مقام حدیث: ص ۱۳۰)

☆ طلوع اسلام کے ایک رکن ڈاکٹر عبدالودود مرکز ملت کی تفسیریوں کرتے ہیں: ”رسول کی زندگی کے بعد فیکم رسول سے مراد ملت کی مرکزی اتھارٹی ہے جو رسول کا فریضہ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن منکر ادا کرتی ہے۔ اور یہ کہ رسول کے بعد صرف مرکز ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ دینی امور میں فیصلہ کرے۔“ (طلوع اسلام: جون ۱۹۵۹ء)

☆ مزید واضح الفاظ میں پرویز صاحب فرماتے ہیں: ”غور فرمائیے کہ دنیا میں کوئی نظام حکومت کیا اس طرح سے قائم بھی رہ سکتا ہے کہ جس میں یہ

حالت ہو کہ حکومت ایک قانون نافذ کرے اور جس کا جی چاہے، اس کی مخالفت میں کھڑا ہو جائے اور قرآن وحدیث کی کتابیں بغل میں داب کر مناظرہ کا چیلنج دے دے۔ اس آیت مقدسہ کا مفہوم بالکل واضح ہے جس میں اللہ اور رسول سے مراد ہی مرکزِ ملت ہے، اور اولی الامر سے مفہوم افسرانِ ماتحت۔ اس سے مطلب یہ ہے اگر کسی مقامی افسر سے کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو بجائے اس کے کہ وہیں مناقشات شروع کر دو، امر متنازع فیہ کو مرکزی حکومت کے سامنے پیش کرو۔ اسے مرکزی حکومت کی طرف ریفز کر دو۔ مرکز کا فیصلہ سب کے لئے واجب التسلیم ہوگا۔“ (معراج انسانیت: ص ۲۲۵، ۲۲۶)

طلوع اسلام کو حکومت وقت کو یہ اختیار دینا سراسر غلط ہے اور اس کا مقصد حکومت وقت کو شریعت سازی کا اختیار دینا ہے جو قرآن کریم کی رو سے صریحاً حرام ہے:

﴿اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ﴾ (الاعراف: ۳)

”اپنے رب کی طرف سے نازل کردہ وحی کی ہی پیروی کرو اور اس کے ماسوا دیگر ذمہ داروں کی اتباع مت کرو۔“

اس آیتِ کریمہ کی رو سے مسلمانوں کو صرف ما اُنزل، یعنی وحی الہی کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے اور یہی بات دیگر تین آیات میں بھی کہی گئی ہے کہ مسلمانوں کو ما اُنزل اللہ کے علاوہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے۔ اور جو ایسا کرے وہ ظالم، کافر اور فاسق ہے۔ (المائدہ: ۴۴)

اس فکری اشتراک اور بنیاد کی طرف اتنا اشارہ کرنا ہی کافی ہوگا کیونکہ مزید تفصیلات اور اس نظریہ کی تردید مضمون کی متقاضی ہے۔ سردست اس غلط بنیاد کو ذہن میں رکھتے ہوئے قرآن وسنت کی روشنی میں ان سفارشات کا ایک جائزہ ملاحظہ فرمائیں:

**سفارش ۱:** یہ قانون بنا دیا جائے کہ بیوی اگر کبھی تحریری طور پر طلاق کا مطالبہ کرے گی، تو شوہر ۹۰ دن کے اندر اُسے طلاق دینے کا پابند ہوگا۔ وہ اگر ایسا نہیں کرے گا تو یہ مدت گزر جانے کے بعد طلاق واقع ہو جائے گی، الا یہ کہ بیوی اپنا مطالبہ واپس لے لے۔ اس کے بعد شوہر کے لیے رجوع کا حق نہیں ہوگا اور بیوی پابند ہوگی کہ مہر اور نان نفقہ کے علاوہ اگر کوئی اموال و املاک شوہر نے اسے دے رکھے ہیں اور اس موقع پر وہ انہیں واپس لینا چاہتا ہے، تو فصل نزاع کے لئے عدالت سے رجوع کرے یا اس کا مال اُسے واپس کر دے۔

**جائزہ:** اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش بڑی انوکھی اور مغرب کے نظریہ مساواتِ مرد و زن پر ایمان لانے کا نتیجہ ہے۔ یہاں عورت کو بھی اسی طرح طلاق کا حق دیا جا رہا ہے جیسے یہ حق مرد کو حاصل ہے۔ حالانکہ یہ نظریہ قرآن کریم کے صریح خلاف ہے، آیت کریمہ ہے:

﴿أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بَيْنَهُ عَقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ (البقرة: ۲۳۷)

”یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔“

● آیت کریمہ میں شوہر کو عقدِ نکاح کا مالک قرار دیا گیا ہے، اور سنن دارقطنی میں بھی واضح الفاظ میں نبی کریم کا یہ فرمان موجود ہے کہ «ولي عقدة النكاح: الزوج» (۲۸۰/۳)

”عقدِ نکاح کا ذمہ دار مالک شوہر ہے۔“

● اسی طرح قاضی شریح فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے مجھ سے پوچھا کہ بیدہ عقدہ النکاح سے کون مراد ہے؟ میں نے کہا کہ لڑکی کا ولی۔ تو حضرت علیؓ نے جواب دیا: نہیں بلکہ اس سے مراد شوہر ہے: ”لا بل هو الزوج“ (سنن دارقطنی: ۳۷۵۷)

● اسلام کا یہ مسلمہ نظریہ ہے کہ نکاح میں مرد و عورتوں پر انتظامی برتری دی گئی ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے کہ ”مرد و عورتوں پر نگران ہیں، اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو فضیلت دی ہے اور مردان کی کفالت کرتے ہیں۔“ (النساء: ۳۴)

● اور آیات طلاق کے سیاق میں بھی قرآن کریم نے اس امر کی صراحت کر دی ہے کہ

﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَىٰ نِسَائِهِنَّ دَرَجَةٌ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (البقرة: ۲۲۸)

”اور مردوں کو عورتوں پر یک گونہ درجہ حاصل ہے اور اللہ غالب و حکمت والا ہے۔“

مردوں کی یہ ازدواجی برتری ان کی جسمانی ساخت اور زندگی میں ان کے فرائض سے متعلق ہے، یہی وجہ ہے کہ مرد کو تو بیک وقت چار شادیوں کی اجازت ہے لیکن مساواتِ مرد و زن کے قائل بھی یہ مساوات قائم کرنے کے داعی نہیں ہو سکتے کہ عورت کو بھی مرد کی طرح بیک وقت چار شوہر رکھنے کی اجازت ہونی چاہئے یا یہ کہ مساوات کی بنا پر شریعت میں اس کی گنجائش پیدا کی جائے۔

اس اساسی تصور کے بعد نظریاتی کونسل کی مذکورہ بالا سفارش جہاں مرد و عورت کو طلاق میں غیر شرعی مساوات دینے کی کوشش پر مبنی ہے، وہاں مذکورہ بالا سفارش شریعتِ اسلامیہ سے ایک



استہزا اور کھلواڑ کے بھی مترادف ہے۔ شریعتِ اسلامیہ میں مرد و زن کا ازدواجی تعلق صرف نکاح کے ذریعے ہوتا ہے اور جدائی طلاق، لعان یا خلع کے ذریعے جن کے مسلمہ اصول شریعت میں واضح کر دیے گئے ہیں۔ جبکہ زیر نظر سفارش میں نہ تو خلع کے اصول پیش نظر رکھے گئے ہیں اور نہ ہی طلاق کے، اس بنا پر یہ واضح ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ خلع ہے یا طلاق؟ چنانچہ

❶ اگر اس تجویز کو طلاق قرار دیا جائے تو اس میں شوہر کو طلاق دینے کا پابند کرنے کی کیا توجیہ کی جائے جبکہ طلاق تو شوہر اپنی مرضی سے دیتا ہے۔

❷ اگر اس کو خلع سمجھا جائے تو خلع میں بیوی کو حق مہر سے دستبردار ہونا پڑتا ہے، جبکہ یہاں بیوی کا حق مہر اس کے لئے ہی برقرار رکھنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

طلاق کی مذکورہ بالا تجویز عجیب و غریب ہے جو نامعلوم کس شریعت سے ماخوذ ہے۔ یہ نہ تو خلع ہے اور نہ ہی طلاق۔ اس کا تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ

اگر کوئی شخص چند ماہ کے بعد اپنی بیوی کو کسی دوسرے مرد کے ساتھ گھومتا پھرتا پائے تو اس کی بیوی یہ کہہ سکتی ہے کہ کیا میں نے فلاں تاریخ کو تمہیں طلاق کا نوٹس نہیں دیا تھا جس کے ۹۰ دن بعد از خود طلاق واقع ہو گئی تھی اور اس کے بعد میں نے اس شخص سے شادی رچالی ہے۔ کونسل کی اس سفارش کی موجودگی میں شوہر اپنا سامنہ لے کر رہ جائے گا۔

اس بنا پر بعض اہل علم کا یہ کہنا درست ہے کہ اس تجویز کے ذریعے شوہر کو طلاق پر مجبور کیا جا رہا ہے اور عقدِ نکاح کو اس کے ہاتھ سے نکال کر بیوی کے ہاتھ میں بھی تھمایا جا رہا ہے جو قرآن کے الفاظ سے براہِ راست متضاد ہے۔

❸ یہاں یہ نکتہ واضح رہنا چاہئے کہ نکاح و طلاق اور رشتہ داریوں کے معاملے دراصل براہِ راست حقوق اللہ میں سے ہیں جیسا کہ نبی ﷺ نے حجۃ الوداع میں من جملہ دیگر ہدایات کے عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

«فَاتَّقُوا اللَّهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوهُنَّ بِأَمَانِ اللَّهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللَّهِ» (صحیح مسلم: ۱۲۱۸)

”اپنی بیویوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، تم نے اللہ کی امان پر انہیں اپنے عقد میں لیا ہے، اور ان کی شرمگاہوں کو تم نے اللہ کے کلمہ کی بنا پر حلال کیا ہے۔ الخ“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح و طلاق اور رشتہ داریاں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ خاص امور ہیں جن میں کسی قسم کی ترمیم شریعت سازی اور اللہ کے نظام میں دخل اندازی کے مترادف ہے۔  
 ﴿اسی طرح قرآن کریم کی سورۃ الاحزاب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رشتہ داریوں کا ایک نظام دیا ہے اور کسی کے بیٹا کہہ دینے سے کوئی دوسرے شخص کا حقیقی بیٹا نہیں بن جاتا:

﴿وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذَلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ ادْعُوهُمْ لِأَبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ﴾

”اللہ تعالیٰ نے تمہارے منہ بولوں کو تمہارے بیٹے نہیں بنادیا، یہ تو تمہارا محض اپنے منہ سے کہہ دینا ہے، حالانکہ اللہ ہی حق بات کہتا اور راہ راست کی ہدایت دیتا ہے۔ ان منہ بولوں کو ان کے ماں باپ کے نام سے ہی پکارو، یہی اللہ کے ہاں زیادہ قرین انصاف ہے۔“ (الاحزاب: ۴)

اس بنا پر نکاح و طلاق کے نظام میں دخل اندازی کرتے ہوئے کسی کو ۹۰ دن بعد طلاق کا پابند کر دینا ایسے ہی ہے جیسے کوئی عورت کسی شخص کی بیوی ہو اور اس کو خود ساختہ قانون کے تحت اس کے حوالہ عقد سے خارج کر دیا جائے، جبکہ اللہ کے ہاں اسی شخص کی بیوی ہی ہے۔ یہ اللہ کے نظام میں مداخلت اور دین سے استہزا ہے جس پر اسلامی نظریاتی کونسل کو شرمسار ہونا چاہئے۔

**سفرارش ۲:** ”طلاق کے مؤثر ہو جانے کے بعد مطلقہ عورتیں اگر چاہیں تو عدالت شوہر کے معاشی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے لیے قرآن کے مطابق عطا کردہ حق متاع کی مقدار متعین کرنے کا حکم صادر کر سکتی ہے، جو یک مشت بھی ہو سکتی ہے اور ماہ بہ ماہ بھی، جب تک مطلقہ عورت کی اگلی شادی نہ ہو جائے۔“

**تبصرہ:** کونسل کی یہ سفارش مغربی نظریات سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے۔ چند برس قبل ہندوستان میں یہی مسئلہ شاہ بانو کیس کی صورت میں اٹھا تھا جس میں ہندوستان کی ایک اعلیٰ عدالت نے یہ قرار دیا تھا کہ جب تک مطلقہ عورت آگے شادی نہ کر لے، اس وقت تک اس کے سابقہ شوہر کو اس کی حیثیت کے مطابق نان نفقہ دینے کا پابند کیا جائے۔ دلچسپ بات ہے کہ جو نکتہ ایک ہندو ملک کی عدالت کو سوچھا تھا، پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل نے اسے قرآن کریم کی بھی منشا قرار دے لیا جب کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس فیصلہ کے خلاف اس قدر بھرپور تحریک چلائی کہ راجیو گاندھی کو بھارتی پارلیمنٹ سے اس قانون کو ختم کرانے کے

سوا کوئی چارہ نہ رہا اور آخر کار یہ قانون بھارت سے ختم کر دیا گیا۔

اس سفارش کا مقصد بیوی کو شوہر کے مال میں شریک کرنا ہے، چنانچہ ارشاد احمد حقانی نے ۱۸ نومبر کو روزنامہ جنگ میں اپنے کالم میں اس شق کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے کہ ”کونسل نے یہ سفارش کی ہے کہ خاوند پہلی شادی کی صورت میں اپنی جائیداد اور اثاثہ جات کی تمام تفصیل شادی کے وقت لکھ کر دینے کا پابند ہوگا۔ اگر وہ دوسری شادی کر رہا ہے تو اس میں پہلی بیوی اور اس کے بچوں کی تمام تفصیلات بھی درج کرے گا۔“

یہ تجویز مغربی ممالک کے قانون ازدواج سے متاثر ہو کر شامل کی گئی ہے، جیسا کہ برطانیہ کا مشہور قانون ہے کہ شوہر مطلقہ بیوی کو اپنی جائیداد میں سے نصف حصہ دینے کا پابند ہوگا، اور عدالت اس کا تعین شوہر و بیوی کے ذمہ دارانہ رویے اور دیگر متعدد وجوہ کی بنا پر کرے گی، مطلقہ کو ملنے والا یہ حصہ بعض صورتوں میں نصف سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔

(دیکھئے برطانوی قانون Matrimonial Causes Act 1973 کی دفعہ ۲۵)

اسی قانون کی بنا پر چند برس قبل آغا خانی فرقہ کے روحانی پیشوا پرنس کریم آغا خاں نے، جو برطانوی شہریت رکھتا ہے، جب اپنی فرانسیسی بیوی کو طلاق دی تو اس کے ۲ بلین ڈالر کے اثاثہ جات میں سے ایک بلین ڈالر اس کی بیوی کو محض مطلقہ ہونے کی بنا پر حاصل ہو گئے۔ قابل توجہ امر ہے کہ ایک روحانی پیشوا کی جمع کردہ دولت جو دراصل اس کے بجائے، فرقے کے لوگوں کے نذرانوں اور عطیات وغیرہ پر مشتمل تھی، کس طرح ایک غیر مسلم عورت کے ہاتھ لگ گئی.....!!

اسی سے ملتے جلتے ازدواجی قوانین برطانیہ اور یورپ میں بعض سرکار نواز مسلم تنظیمیں ’مسلم میرج ایکٹ‘ کے نام حکومت سے پاس کروانے کے لئے کوشاں ہیں جس کے ذریعے وہ یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ مسلمان یورپ وغیرہ میں الگ تشخص کی بجائے یورپی اقوام میں گھل مل کر رہنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک اس تجویز کے شرعی پہلو کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں قرآن کریم کی آیت اور مفسرین و فقہاء کا موقف ملاحظہ فرمائیے، سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۳۶ کے الفاظ ہیں:

﴿قَمِيتَعُوهُنَّ عَلَى الْمَوْسِعِ قَدَرًا وَعَلَى الْمُقْتَرِ قَدَرًا مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ﴾

”تم انہیں بوقت طلاق فائدہ پہنچاؤ، کشائش والا اپنی قدرت کے مطابق اور تنگ دست اپنی گنجائش کے مطابق، معروف طریقے سے فائدہ پہنچانا۔“

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں ازدواجی ناہمواریوں کا انجام باہمی نفرت و عداوت کی بجائے اس طرح ہونا چاہئے کہ مرد اپنی مطلقہ بیوی کو حسن سلوک اور مالی تحائف وغیرہ دے کر رخصت کرے کیونکہ اس سے عورت کو نفسیاتی تسکین حاصل ہوگی، آخر کار وہ اس مرد کی انتہائی قریبی شخصیت رہ چکی ہے اور اس کے بچوں کی ماں بھی ہے، تاکہ مستقبل میں دونوں کی باہمی رنجش و مخالفت سے اگلی نسل حتیٰ الامکان کم سے کم متاثر ہو۔

جہاں تک مطلقہ عورت کو ساز و سامان دینے کا تعلق ہے تو امام شافعیؒ و جمہور علماء کے بقول یہ محض مستحب امر ہے جس پر شوہر کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ اگر یہ ساز و سامان واجب ہوتا تو اس کی بنا پر عدالتیں لوگوں کو پابند کیا کرتیں، لیکن آج تک کسی عدالت نے اس بنا پر شوہر کو قید وغیرہ نہیں کیا۔ دراصل یہ ساز و سامان ایسی مطلقہ عورت کے حق میں تو ضروری ہے جس کو ہم بستر سے قبل طلاق دی گئی ہو جیسا کہ حضرت عمرؓ نے اس کو حق مہر کا متبادل قرار دیا ہے اور امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ ایسی صورت میں اگر باہم اتفاق نہ ہو تو نصف حق مہر ادا کرنا ہوگا، جیسا کہ اگلی آیت میں اس کی صراحت بھی آگئی ہے۔

الغرض شریعت اسلامیہ میں اس امر کو مستحب قرار دیا جاسکتا ہے کہ مطلقہ عورت کو خوش اُسلوبی اور تحائف وغیرہ کے ساتھ رخصت کیا جائے لیکن عدالتی سطح پر اس کو واجب قرار دینا شریعت سازی ہے اور مغرب نوازی ہے جس کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

**سفارش ۳:** طلاق کی رجسٹریشن کے نظام کو موثر بنایا جائے اور اس کی رجسٹریشن بھی اسی طرح ہونی چاہیے جس طرح نکاح کی رجسٹریشن ہوتی ہے۔

اس سفارش کا مقصد یہ پیش کیا گیا ہے کہ اس طرح ایک مجلس کی تین طلاقیں میں کمی آئے گی، ہر طلاق علیحدہ رجسٹر ہونے کے بعد دوسری طلاق علیحدہ دی جائے گی۔ کونسل کی سفارش کا یہ پہلو اگرچہ درست ہے، لیکن یاد رہنا چاہئے کہ نکاح و طلاق کے منعقد ہونے کا انحصار ان کے شرعی

تقاضوں کی تکمیل پر ہی موقوف ہے۔ جہاں شرعی تقاضے پورے ہو جائیں وہاں نکاح و طلاق واقع ہو جاتے ہیں، اس تجویز کی حیثیت مزید تلقین سے زیادہ نہیں اور نکاح و طلاق کو اس پر منحصر قرار دینا شرعی نظام میں اضافہ اور مداخلت ہے جس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں۔

**سفرارش ①:** ”کونسل نے محرم کے بغیر خواتین کے سفر حج کے بارے میں فیصلہ دیا۔ دستور پاکستان اور دیگر ملکی قوانین کے تحت خواتین آزادی سے اندرون ملک اور بیرون ملک سفر کر سکتی ہیں، اس پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ سعودی عرب کے قوانین کونسل کے دائرہ اختیار میں نہیں آتے۔“

**جائزہ:** اس سفارش کے پس پردہ یہ گمراہ کن تصور موجود ہے کہ زمانہ کی ترقی کے باعث شریعت میں تبدیلی ہونی چاہئے اور حکومت کو اس امر کا اختیار ہونا چاہئے کہ وہ حالات کی رو رعایت سے شریعت میں ترمیم کر سکے۔ جبکہ دراصل شریعت کے اس حکم میں غایت درجہ حکمت موجود ہے، اس میں مردوں کو یہ ذمہ داری دی گئی ہے کہ دوران سفر کی صعوبتوں اور پریشانیوں سے نمٹنے کے لئے وہ اپنی خواتین کے ہمراہ موجود ہوں۔ اسلام میں زندگی کے کسی مرحلہ پر بھی نہ تو عورت پر اپنی مالی کفالت کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور نہ ہی اپنی حفاظت کی۔ بلکہ ہمیشہ سے یہ دونوں ذمہ داریاں ان کے انتہائی قریبی مرد حضرات کے ذمے ہیں، کیونکہ جب بھی عورت کو اپنی مالی ضروریات یا جسمانی تحفظ کے لئے کسی غیر محرم مرد کا محتاج ہونا پڑے گا، ایسی صورت میں عورت کو خود استحصال اور حرص و ہوس کا نشانہ بننا ہو گا۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے مذکورہ بالا سفارش کے ذریعے دراصل اسلام کے تصور اختلاف مرد و زن کی ممانعت کو سمجھے بغیر مغرب کی مادر پدر آزاد تہذیب کا راستہ کھولا ہے۔ جبکہ یہ حقیقت ہے کہ دور جدید کی ترقی کے باوجود دو صنفوں کی یہ باہمی کشش اور کشمکش پہلے سے کم ہونے کی بجائے کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ عورت کے اسی تحفظ کے لئے اللہ تعالیٰ نے مبارک ترین سفر حج و عمرہ میں بھی محرم مرد کا ساتھ ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ اس بارے میں نبی کریم ﷺ کے فرامین مقدسہ بالکل واضح ہیں جنہیں ہماری کونسل تبدیل کرنے کی نامراد سعی کر رہی ہے:

① « لا یحل لامرأة تؤمن بالله والیوم الآخر أن تسافر مسیرة یوم وليلة لیس معها حُرمة » (صحیح بخاری: روایت حضرت ابو ہریرہؓ: رقم ۱۰۸۸)

”کسی عورت کو جائز نہیں جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتی ہو کہ وہ ایسی حالت میں ایک دن رات کا سفر کرے کہ اس کے ساتھ محرم مرد موجود نہ ہو۔“

② «لا تسافر المرأة إلا مع ذي محرم ولا يدخل عليها رجل إلا ومعها محرم، فقال رجل: يا رسول الله! إني أريد أن أخرج في جيش كذا وكذا، وأمرأتي تريد الحج. فقال: أخرج معها» (صحیح بخاری: ۱۸۶۸)

”کوئی بھی عورت اپنے محرم مرد کے بغیر سفر ہرگز نہ کرے۔ اور اس کے پاس کوئی غیر مرد نہ آئے الا یہ کہ عورت کے ساتھ اس کا محرم مرد بھی موجود ہو۔ ایک شخص نے پوچھا کہ میں فلاں فلاں لشکر میں جانا چاہتا ہوں اور میری بیوی حج کرنا چاہتی ہے، تو آپ نے فرمایا: اپنی بیوی کے ساتھ حج پر جاؤ۔“

معلوم ہوا کہ محرم رشتہ داروں کا بھی فرض ہے کہ افضل ترین اعمال پر بھی اپنی خواتین کی سفری ضروریات کو ترجیح دیں کیونکہ مرد و زن کے آزادانہ اختلاط کی ممانعت کی یہ بنیادی ضرورت ہے۔ اس موضوع پر نبی کریم ﷺ کے مزید فرامین موجود ہیں، مثلاً

③ «لا يخلون رجل بامرأة إلا كانا لثهما الشيطان» (جامع ترمذی: ۱۱۷۱)

”کوئی بھی غیر محرم مرد کسی عورت کے ساتھ علیحدگی میں نہیں ہوتا، مگر ان کے ساتھ تیسرا شیطان ہوتا ہے۔“ (جو انہیں برے کام کی تلقین کرتا ہے)

یہ مسئلہ پوری ملتِ اسلامیہ کا اجماعی مسئلہ ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں:

اتفق الفقهاء على أنه يحرم على المرأة أن تسافر بمفردها وأنه لا بد من وجود محرم أو زوج معها (الموسوعة الفقهية: ۳۷/۲۵)

”فقہائے عظام کا اتفاق ہے کہ عورت کے لئے اکیلے سفر کرنا حرام ہے، اور اس کے ساتھ سفر میں کوئی محرم یا شوہر ہونا از بس ضروری ہے۔“

فرامینِ نبویہ کی صراحت اور حکمت روزِ روشن کی طرح واضح ہے، اور سعودی حکومت کا سفر حج میں محرم کو لازمی کرنے کی شرعی وجہ یہی ہے، لیکن ہمارے نام نہاد شرعی ماہرین پاکستانی حکومت کو اس حکم شرعی میں ترمیم کی تلقین کر کے قوم کو باور کر رہے ہیں کہ شریعت میں اس قسم کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔

**سفرارش ۴:** ”خالص سائنسی طریقے سے مکہ مکرمہ کو مرکز بنا کر چاند کی ولادت کے لحاظ



سے پوری دنیا کے لیے ایک ہجری کیلنڈر بنادیا جائے اور تمام مذہبی تہوار اسکے مطابق منائے جائیں۔“  
**جائزہ:** کونسل کی یہ سفارش بھی سراسر فرامینِ نبویہ سے متصادم ہے۔ دراصل کونسل کا مطمح نظر اسلام کی ترجمانی نہیں بلکہ ایسی سفارشات کونسل کے تجدید زدہ اراکین کی مغرب سے مروجیت کا برملا اظہار ہے جو مغربی میڈیا کے بے جا اعتراضات کا جواب دینے کی اہلیت سے تو عاری ہیں، نتیجتاً اسلام کو توڑ موڑ کر اس کا حلیہ بگاڑ رہے ہیں۔

دنیا بھر میں مسلمانوں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے مذہبی تہوار ایک دن کیوں نہیں ہوتے، ایک قوم ہوتے ہوئے مختلف خطہ ارضی میں عیدین اور رمضان وغیرہ کا آغاز و اختتام مختلف کیوں ہوتا ہے؟ دراصل یہ اعتراض بودا اور مغالطہ آمیز ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر میں تمام مسلمان ایک ہی دن یعنی یکم شوال کو عید الفطر اور ۱۰ رذی الحجہ کو عید الاضحیٰ مناتے ہیں۔ جہاں بھی یہ تہوار منائے جاتے ہیں، وہاں یکم شوال ہی ہوتی ہے۔ اگر یہ اعتراض اہل مغرب پر کیا جائے کہ وہ دنیا بھر میں کرمس اور ایسٹراک یک ہی دن کیوں نہیں مناتے تو یہ زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ بعض ممالک میں کرمس ہجری تقویم کی ایک تاریخ کو ہوتی ہے اور بعض میں اس سے اگلی یا پچھلی تاریخ کو۔ دراصل بنیادی سوال یہ ہے کہ بنیادی، فطری اور سائنسی تقویم کس کو قرار دیا جائے؟ قرآن کریم، فرامینِ نبویہ، تاریخ اقوام اور زمینی حقائق کی رو سے یہ حیثیت صرف ہجری تقویم کو حاصل ہے اور وہی حقیقی مطلوب تقویم الہی ہے۔ موضوع تفصیل طلب ہے، اس لئے راقم کے مستقل مضمون کی طرف رجوع فرمائیے۔

پھر یہ امر واقعہ ہے کہ سائنسی اعتبار سے بھی دنیا بھر میں نہ تو ایک ہی حقیقی وقت میں عید ہو سکتی ہے اور نہ ہی کرمس۔ بلکہ اعتباری یا فرضی طور پر ہی انہیں ایک وقت میں منعقد کرنا ممکن ہے۔ چنانچہ پاکستان میں جس وقت (۷ بجے شام) چاند طلوع ہوتا اور نئے رات و دن کا آغاز ہوتا ہے، دنیا کے بعض خطوں (میکسیکو) میں اس وقت صبح کے ۱۰ بج رہے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے فوری اطلاع مل جانے کے بعد بھی نہ تو وہاں روزہ رکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی نمازِ عید پڑھی جاسکتی ہے۔ غرض طبعی حقائق کی روشنی میں یہ امر ناممکن ہے کہ حقیقی طور پر ایک ہی دن تہوار منائے جاسکیں۔ اسی طرح دنیا بھر میں بعض ممالک میں کرمس کا آغاز ہو رہا ہوتا ہے اور

بعض میں یہ ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ چنانچہ عملاً ایک ہی حقیقی وقت میں تہوار منعقد کرنے کا نظریہ حقائق سے لاعلمی اور ایک جذباتی ڈھکوسلا ہے۔ البتہ اعتباری طور پر ایسا کرنا ممکن ہے، اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ یکم شوال کو ہی دنیا بھر میں عید الفطر ہوتی ہے جس طرح ۲۵ دسمبر کو ہی اوقات کے کئی گھنٹوں کے فرق کے باوجود دنیا بھر میں کرسمس منائی جاتی ہے۔

اس طبعی حقیقت کا ادراک نبی اکرم ﷺ کو توحی کی روشنی میں حاصل تھا، لیکن آج کے ترقی یافتہ اور باشعور ہونے کا دعویٰ کرنے والے اور اس بنا پر اسلام میں تبدیلی کا تقاضا کرنے والے اس سے نابلد ہیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے دسیوں فرامین میں روزہ کو چاند کی رویت بصری پر منحصر قرار دیا ہے اور اس کو کسی سائنسی حساب پر منعقد نہیں کیا، کیونکہ سائنس لاکھ دعووں کے باوجود آج تک اسلامی تقاضوں کے مطابق درست ہجری تقویم تشکیل دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی، یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں ہر سال چھپنے والی تمام ڈائریوں میں ہجری تقویم میں لازماً خرابی مشاہدہ میں آتی ہے۔ اگر اس کا کوئی سائنسی نظام وضع کر لیا گیا ہے تو پھر اس کے مطابق چند سال درست طور پر پیش کرنے تو بہر حال ضروری ہیں۔

یہ تو سائنسی حساب پر اکتفا کرنے کا نظریہ ہوا، جس کے خلاف اُمتِ مسلمہ کا قدیم سے بقول علامہ ابن تیمیہؒ اجماع چلا آ رہا ہے۔ علاوہ ازیں کونسل کا یہ قرار دینا کہ چاند کی ولادت پر قمری مہینے کا آغاز کیا جائے، یہ بھی درست نہیں۔ کیونکہ شرعی اعتبار سے قمری ماہ کا آغاز ولادت قمر کی بجائے رویتِ قمر سے ہوتا ہے۔ ولادتِ قمر تو محض ایک سائنسی حقیقت ہے جبکہ رویتِ قمر ایک روزمرہ معمول، واضح رہے کہ دین ہر دور اور ہر فرد کیلئے ہے نہ کہ صرف سائنسدانوں کے لئے! جہاں تک مقام کے لحاظ سے مکہ مکرمہ کو رویت میں مرکزی حیثیت دینے کی بات ہے تو یہ نظریہ بھی خلافِ اسلام ہے کیونکہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کریبؓ سے فرمایا کہ ہمیں نبی کریم ﷺ نے ملک شام کی بجائے اپنی (یعنی مدینہ منورہ کی) رویت کا پابند بنایا ہے: ”ہکذا أمرنا رسول اللہ“ (صحیح مسلم: ۱۸۱۹)

اس موضوع پر مزید احادیث بھی موجود ہیں، حدیث کی ہر کتاب میں اس موضوع کو زیر بحث لا کر یہی ثابت کیا گیا ہے کہ تمام دنیا تو کجا، عالم اسلام میں بھی ایک دن عید اور تہوار منعقد

کرنا درست نہیں۔ صرف کتب احادیث کے عناوین ملاحظہ فرمائیے:

جامع ترمذی کا باب: باب ما جاء لكل أهل بلد رؤيتهم  
صحیح مسلم میں باب بیان أن لكل بلد رؤيتهم وأنهم إذا رأوا الهلال  
ببلد لا يثبت حكمه لما بعد منهم  
صحیح بخاری میں باب لكل بلد رؤيتهم (معروف نسخ میں یہ باب نہیں)  
سنن نسائی میں باب اختلاف أهل الآفاق في الرؤية  
سنن ابوداؤد میں باب إذا رءي الهلال في بلد قبل الآخرين بلبلة  
صحیح ابن خزیمہ میں باب الدليل على أن الواجب على كل أهل بلد  
صيام رمضان لرؤيتهم لا لرؤية غيرهم  
منقح الاخبار میں باب الهلال إذا رآه أهل بلد هل يلزم بقية البلاد  
الصوم (امام ابن تیمیہ نے)

’جامع الاصول‘ میں باب اختلاف البلد في الرؤية (علامہ ابن اثیر)  
مصنف ابن ابی شیبہ میں فی القوم يرون الهلال ولا يرون الآخرون  
امام ترمذی نے مذکورہ بالا باب کے تحت کرب کی روایت کردہ حدیث ابن عباسؓ کو  
ذکر کر کے فرمایا ہے: ”ابن عباسؓ کی حدیث حسن صحیح ہے، اور اکثر اہل علم کا اسی پر عمل ہے۔“  
سابقہ مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی اُمت مسلمہ کا متفقہ اجماعی موقف ہے۔ چنانچہ علامہ ابن  
عبدالبر نے اس پر اجماع ذکر کیا ہے کہ اندلس اور خراسان کی رویت ایک دوسرے کے لئے  
قطعاً معتبر نہیں ہے۔ (الاستدکار: ۳۰/۱۰) علمائے احناف میں سے علامہ زیلعیؒ اور علامہ عبدالحی  
لکھنویؒ نے اختلافِ مطالع کو معتبر تسلیم کیا ہے اور ندوة العلماء، لکھنؤ کی مجلس تحقیقات شرعیہ نے  
۲۴، ۳۱ مئی ۱۹۶۷ء کو اپنے فیصلہ میں اختلافِ مطالع کو تسلیم کرتے ہوئے قرار دیا ہے کہ  
”محققین احناف اور علمائے اُمت کی تصریحات اور ان کے دلائل کی روشنی میں مجلس کی متفقہ  
رائے یہ ہے کہ بلادِ بعیدہ میں اختلافِ مطالع معتبر ہے۔“ (جدید فقہی مسائل: ۸۹/۱ تا ۹۳)

گویا بلادِ بعیدہ کی رویت کا باہمی اعتبار شریعتِ مطہرہ میں نہیں ہے، کجایہ کہ دنیا بھر کو ہی

ایک ہی رویت مکہ مکرمہ کا تابع کر دیا جائے۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے دنیا بھر میں نمازوں کے اوقات وہی کر دیے جائیں جو مکہ مکرمہ کے ہیں تاکہ عالمی وحدت حاصل ہو جائے۔ جبکہ نمازوں اور تہواروں کے اوقات و ایام مختلف ہونے میں، جہاں مظاہر قدرت سورج اور چاند کو معیار ٹھہرایا گیا ہے، وہاں یہ بھی حکمت ہے کہ ہر دن اور ہر وقت میں دنیا بھر میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہوتی رہے اور کرۂ ارضی کا کوئی لمحہ بھی اس دعا و مناجات سے خالی نہ جائے۔

اس موضوع پر راقم کا تفصیلی مضمون جس میں ہر پہلو سے دلائل جمع کر دیے گئے، ملاحظہ فرمائیں: 'ہجری تقویم اور مسئلہ رویت ہلال' شائع شدہ 'محدث' ستمبر ۲۰۰۷ء

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں عبادات سے لے کر زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں بے انتہا نظری عقائد و تصورات اور عملی احکام و شرائع موجود ہیں۔ لیکن جمہوریت کے لازمی 'سیکولرزم' کو جاری و ساری کرنے کے نتیجے میں آج مسلم ممالک میں عملاً اجتماعی، سماجی یا معاشرتی اسلام کی بساط تقریباً لپیٹی جا چکی ہے اور عملاً ان جملہ معاشرتی میدانوں میں مغربی نظریات کی کارفرمائی ہی نظر آتی ہے۔ مسلمانوں کی بطور قوم ذلت کی وجہ بھی مسلم ریاستوں کے اسی ظلم میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے ترقی کے نام پر اسلام کے نظام سیاست و عدالت، نظام معاشرت و معیشت اور نظام تعلیم و ابلاغ کو معطل کر رکھا ہے۔ جب کسی میدان میں مسلم احکام و نظریات زیر عمل ہی نہ ہوں تو اس قوم کی کامیابی و کامرانی کی اُمید کرنا کارِ عبث ہے۔

ان معاشرتی نظاموں میں سے اکثر مسلم ممالک میں خاندانی نظام ہی ایسا واحد پہلو بچا ہے جس پر آج بھی جزوی طور پر عمل ہو رہا ہے۔ اور اسلام پر عمل کرنے کے سبب یہی وہ واحد اجتماعی نظام ہے جس کی بنا پر آج ہم مطمئن و سرخرو ہیں اور اہل مغرب ہم پر رشک کرتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کو جس میدان میں بھی حقیقی طور پر نافذ کیا جائے گا، اس میں مسلمان دیگر اقوام کے لئے ایک قابل اتباع نمونہ قرار پائیں گے۔

لیکن مقامِ افسوس یہ ہے کہ ایک ایسا خاندانی نظام جو آج ہماری لئے کافی حد تک باعثِ افتخار ہے، اس میں بھی ہم ایسی تبدیلی لانا چاہتے ہیں جو اس کے جوہر کو ختم کر کے ہمیں مغرب

کے ٹوٹے پھوٹے خاندانی ڈھانچے کے قریب تر لے آئے۔ نظریاتی کونسل کی مذکورہ بالا سفارشات کا زیادہ تر تعلق خاندانی نظام سے ہی ہے جس میں ایسی ’اصلاحات‘ تجویز کی گئی ہیں جو دنیا میں غالب نظام کفر سے ممکنہ مماثلت حاصل کرنے کا مذموم ہدف رکھتی ہیں۔

مزید برآں مرد و عورت کے آزادانہ اختلاط کی ممانعت اور دونوں کو اپنے اپنے دائرہ کار میں کام کرنے کی تلقین بھی اسلام کے نظام معاشرت کا اساسی تصور ہے۔ ایسے ہی ہجری کیلنڈر کو عیسوی کیلنڈر کی طرح خود ساختہ اصولوں پر استوار کرنا بھی شریعت کے احکامات صریحہ میں مداخلت ہے۔ یاد رہے کہ تقویم بھی مسلم نظام معاشرت کا ایک مرکزی تشخص ہے۔ کونسل کی اکثر سفارشات اسی بچے کچھے مسلم نظام معاشرت کی مزعومہ اصلاح سے تعلق رکھتی ہیں۔

الغرض مسلمانوں کے خاندانی نظام میں اہل مغرب کے تصورات کو پروان چڑھانا اور معاشرتی نظام میں سیکولر نظریات کو فروغ دینا نظریاتی کونسل کا ایسا سیاہ کارنامہ ہے جو اس کے مقام و مرتبہ پر کسی بد نما دھبے سے کم نہیں ہے!

اوپر ذکر کردہ دس میں سے پانچ سفارشات کے مختصر جائزہ سے واضح طور پر یہ علم ہو جاتا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی یہ سفارشات شریعت اسلامیہ میں تحریف اور دخل اندازی کی موجب ہیں۔ یہ سفارشات اسلامی نظریاتی کونسل کی بجائے کسی الحادی ادارے یا فرد سے صادر ہوتیں تو مناسب ہوتا۔ ان حالات میں حکومت وقت کا فرض ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کو ایسے مغرب نواز سکالروں سے پاک کر کے، شرع متین کی حقیقی ترجمانی کرنے والے اہل علم کو یہاں متعین کرے، تاکہ ماضی کی طرح یہ ادارہ قوم اور حکومت کو شرعی امور میں درست رہنمائی دے سکے۔

ان سفارشات کے مذکورہ بالا جائزہ کی روشنی میں پاکستان بھر کے دینی حلقوں اور اہل علم کا یہ مطالبہ سو فیصد درست ہے کہ کونسل کی تشکیل نو کی جائے، آئینی مطالبے پورے کئے جائیں اور اسلام کے نام پر حاصل کئے جانے والے ملک میں اسلام کے نام پر تہذیبِ افرنگ کے فروغ کا مذاق بند کیا جائے۔

(حافظ حسن مدنی)

محمد رفیق چودھری

حدیث و سنت

سلسلہ سوم

## جاوید احمد غامدی اور انکارِ حدیث

فاضل مقالہ نگار نے چند برس قبل محدث میں 'جاوید غامدی کے منحرف افکار' سے اُمت کو آگاہ کرنے کے لئے ایک علمی سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ مضامین کے ساتھ ساتھ ان کے غلط افکار پر انہوں نے شعر و ادب کی زبان میں بھی کڑی تنقید کی۔ یہ سلسلہ باقاعدگی کے ساتھ محدث میں جاری و ساری تھا کہ چند ماہ پیشتر فاضل محقق ایک ٹریفک حادثہ کا شکار ہو گئے اور قتل پیدا ہو گیا۔ اس وقت تک یہ واحد سلسلہ مضامین ہے جس میں غامدی صاحب کے مختلف غلط افکار کا انہی کے دیگر ارشادات کی روشنی میں جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اللہ کا بے پایاں شکر و احسان ہے کہ مولانا محمد رفیق چودھری چند ماہ بسترِ علالت پر گزارنے کے بعد صحت یاب ہو چکے ہیں اور اب دوبارہ خدمتِ دین کے لئے میدانِ علم و تحقیق میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مبارک مساعی کو قبول و منظور فرمائے اور اُمتِ مسلمہ کو نئے فتنوں اور انحرافات سے غایت نصیب فرمائے۔

زیر نظر مضمون غامدی صاحب کے تصورِ حدیث پر لکھے گئے مضامین کا تیسرا نقش ہے، یہ مضامین اپنی جگہ مستقل افادیت بھی رکھتے ہیں، البتہ سابقہ مضامین کو پڑھنے کے لئے محدث کے شمارہ جنوری اور فروری ۲۰۰۸ء کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ ان مضامین پر مشتمل ایک مستقل کتاب 'غامدی مذہب کیا ہے؟' کے نام سے مستقل طور پر دوبار شائع ہو کر شائقین سے داد و وصول کر چکی ہے۔ ح م

غامدی صاحب کا دعویٰ ہے کہ حدیث کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ دین کا حصہ نہیں، یہ دین سے الگ کوئی غیر اہم شے ہے۔ دین کا کوئی عقیدہ اور عمل اس سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اگر احادیث کی کچھ اہمیت ہوتی اور یہ بھی دین کا حصہ ہوتیں تو ان کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لئے خود رسول اللہ ﷺ نے ایسا کوئی اہتمام کیوں نہیں فرمایا؟

چنانچہ جاوید غامدی اپنی کتاب 'میزان' میں 'مبادی' تدبر حدیث کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

”نبی ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی روایتیں جو زیادہ تر اخبارِ آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں اور جنہیں اصطلاح میں 'حدیث' کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں یہ دو باتیں ایسی واضح ہیں کہ کوئی صاحبِ علم انہیں ماننے سے انکار نہیں کر سکتا۔



ایک یہ کہ رسول ﷺ نے ان کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لئے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔  
دوسری یہ کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ کبھی علم یقین کے درجے تک نہیں پہنچتا۔

حدیث سے متعلق یہی دو حقائق ہیں جن کی بنا پر یہ ماننا تو ناگزیر ہے کہ اس سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔“ (میزان: ص ۶۸، طبع اپریل ۲۰۰۲ء، لاہور)

☆ ایک خطبہ حجۃ الوداع کے متعلق البتہ کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے دوسروں تک پہنچانے کی ہدایت فرمائی تھی، لیکن اس کے بھی چند جملے ہی روایتوں میں نقل ہوئے ہیں۔ اسکے علاوہ کسی چیز کے بارے میں اس نوعیت کی کوئی چیز تاریخ کے کسی مستند ماخذ میں مذکور نہیں۔  
ذیل میں ہم سب سے پہلے غامدی صاحب کی اس پُر فریب اور مغالطہ انگیز تحریر کا تجزیہ کریں گے اور پھر اس پر جامع تبصرہ کیا جائے گا۔

### مغالطہ انگیزی اور فریب دہی

① اہل علم جانتے ہیں کہ حدیث کے اصطلاحی مفہوم میں خبر متواتر (اخبار متواترہ) بھی شامل ہوتی ہے، لیکن مذکورہ عبارت کے ذریعے غامدی صاحب نے اخبار متواترہ کو حدیث کے اصطلاحی مفہوم سے نکالنے اور اسے محض اخبارِ آحاد کے مفہوم میں محدود کر دینے کے لئے لکھ دیا ہے کہ اس سے صرف وہی روایتیں مراد ہیں:  
”جو زیادہ تر اخبارِ آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں۔“

اس طرح غامدی صاحب نے اپنے قارئین کو دھوکا اور فریب دینے کے لئے اصطلاح تو محدثین سے لی ہے مگر اُسے اپنے ذاتی معنی پہنا کر پیش کر دیا ہے۔

غامدی صاحب اس بات کے عادی ہیں کہ وہ معروف دینی اور شرعی اصطلاحیں تو علمائے اسلام سے لیتے ہیں مگر ان اصطلاحوں کے مفہیم بدل کر انہیں اپنے من پسند معنی پہناتے ہیں۔ یہی حرکت انہوں نے ’سنت‘ کی دینی اصطلاح کے بارے میں بھی کی ہے اور اس کے اصطلاحی مفہوم کو چھوڑ کر اپنا یہ اختراعی مفہوم مراد لے لیا ہے کہ

”سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔“ (میزان: ص ۱۰، طبع اپریل ۲۰۰۲ء، لاہور)

اسی طرح دیگر دینی اصطلاحات کے ساتھ بھی وہ یہی سلوک کرتے ہیں۔ ایک طرف وہ شرعی اصطلاحوں کے اصلی مفہیم سے انکاری ہیں مگر انہی اصطلاحات کے استعمال پر مُصر ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ منکرے بودن وہم رنگِ مستان زیستن

② غامدی صاحب نے مذکورہ عبارت کے ذریعے اپنے قارئین کو دوسرا یہ دھوکا اور مغالطہ دینے کی سعی فرمائی ہے کہ انہوں نے شروع ہی میں یہ کہہ دیا ہے کہ وہ آگے چل کر جن باتوں کا دعویٰ کریں گے اور جو کچھ اپنے جی سے بیان کریں گے، وہ از خود اتنی واضح اور مبنی بر حقیقت ہوں گی کہ کوئی صاحبِ علم نہ تو اُن سے اختلاف کر سکتا ہے اور نہ اُن کو ماننے سے انکار کی جرات کر سکتا ہے؟ جبکہ اُن کے کسی دعوے کو تسلیم کرنا کسی صاحبِ علم پر لازم نہیں اور وہ غامدی صاحب کی کسی بھی بات سے اختلاف کا حق رکھتا ہے، کیونکہ شریعت اسلامیہ میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے سوا ہر شخص سے اختلاف کی گنجائش ہے اور اس حوالے سے قرآن و سنت کی نصوص کی تصریحات موجود ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا غامدی صاحب معصوم عن الخطا ہیں کہ اُن کی کسی بات میں غلطی کا کوئی امکان نہیں؟ یا وہ وحی کی زبان میں گفتگو فرماتے ہیں کہ ان سے دوسرے اہل علم کو اختلاف کی مجال نہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ کس برتے پر اپنے خیالات اور دعاوی کے بارے میں کہتے ہیں کہ

”یہ دو باتیں ایسی واضح ہیں کہ کوئی صاحبِ علم انہیں ماننے سے انکار نہیں کر سکتا۔“

گویا ہر صاحبِ علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ غامدی صاحب کے رطب و یابس پر آمنا و صدقنا کہے، ورنہ اُسے صاحبِ علم ہونے کے اعزاز سے محروم ہونا پڑے گا۔

③ مذکورہ تحریر کے ذریعے غامدی صاحب یہ مغالطہ اور دھوکا بھی دینا چاہتے ہیں کہ پہلے تو وہ جوش میں آ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ

”رسول اللہ ﷺ نے حدیث کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لئے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔“

لیکن پھر اُن کو جلد یہ خیال آ جاتا ہے کہ اتنا بڑا جھوٹ تو کسی عام پڑھے لکھے آدمی کو بھی ہضم نہیں ہوگا، اس لئے وہ اس عبارت کے نیچے فٹ نوٹ میں دے لفظوں کے ساتھ لکھ

دیتے ہیں کہ

”ایک خطبہ حجۃ الوداع کے متعلق البتہ کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے (حدیث کو) دوسروں تک پہنچانے کی ہدایت فرمائی تھی۔“

پھر چونکہ اس حوالے سے بھی اُن کے اپنے مذکورہ بیان کی تردید کا پہلو نکلتا تھا، اس لئے پھر پینترا بدل کر آگے عبارت میں یہ اضافہ کر دیا کہ

”لیکن اس کے بھی چند جملے ہی روایتوں میں نقل ہوئے ہیں۔“

غامدی صاحب نے ان الفاظ کا اضافہ کر کے نبی ﷺ کے اس عظیم الشان خطبہ حجۃ الوداع کی تعلیمات اور احکام کی اہمیت گھٹانے کی سعی نامراد فرمائی ہے۔ وہ خطبہ جو حضور ﷺ نے لاکھوں صحابہ کرامؓ کے مجمع کے سامنے دیا جو انسانی حقوق کا سب سے بڑا منشور (Charter) ہے اور جو دین اسلام کا مکمل پیغام ہے۔ غامدی صاحب اُسے یہ کہہ کر ٹھکرا رہے ہیں کہ

”لیکن اس کے بھی چند جملے ہی روایتوں میں نقل ہوئے ہیں۔“

آخر کیا رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور فرامین و احکام کی یہی حیثیت ہے کہ ان کو مذکورہ گستاخانہ الفاظ میں بیان کیا جائے؟

③ مذکورہ حوالے کے ذریعے غامدی صاحب نے دوسروں کو چوتھا یہ مغالطہ اور فریب دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ آگے اسی فٹ نوٹ میں فرماتے ہیں کہ

”اس کے علاوہ کسی چیز کے بارے میں اس نوعیت کی کوئی چیز تاریخ کے کسی مستند ماخذ میں مذکور نہیں۔“

ان الفاظ سے غامدی صاحب دوسروں کو یہ باور کراتے ہیں کہ وہ کسی بھی بات کو ماننے کے لئے تیار ہیں جو تاریخ کے کسی مستند ماخذ میں مذکور ہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جو شخص بخاری اور مسلم کی متفق علیہ اور صحیح احادیث کو کچھ اہمیت نہ دیتا ہو اور اُن کو ماننے کے لئے ہرگز آمادہ نہ ہو، وہ ’تاریخ کے کسی مستند ماخذ‘ کو کیسے مان کر دے گا؟ جس آدمی کا نظریہ یہ ہو کہ

”کسی چیز کو بھی خواہ وہ حدیث کی اُہمات کتب بخاری و مسلم اور مؤطا امام مالکؒ ہی میں کیوں

نہ بیان ہوئی ہو، آپ کی نسبت سے ہرگز کوئی اہمیت نہ دی جائے۔“

(ملاحظہ ہو غامدی صاحب کی کتاب ’میزان‘: ص ۶۹، طبع اپریل ۲۰۰۲ء، لاہور)

تو کیا جو آدمی بخاری اور مسلم کی روایات کو نہیں مانتا، وہ ابنِ خلدون اور طبری کی کتب تاریخ کو مان لے گا؟ جو شخص اجماعِ قطعی سے ثابت شرعی احکام کو تسلیم نہیں کرتا، وہ طبقات ابنِ سعد اور تاریخ مسعودی کو کیسے تسلیم کر لے گا؟

قارئین کرام! میں اصل موضوع پر بحث کرنے سے پہلے تمہید کے طور پر غامدی صاحب کے اندازِ بیان کے دجل و فریب کا پردہ چاک کر رہا ہوں تو اس سے میرا مقصود صرف یہ ہے کہ میں آپ کو اس شخص کے ’طریق واردات‘ سے آگاہ کر دوں جو ”زخرف القول غرورا“ کے مصداق اپنے مخاطب کو فریب دینے کا عادی ہے۔

اب ہم اصل بحث کی طرف آتے ہیں۔ غامدی صاحب کا دعویٰ ہے کہ ”رسول اللہ ﷺ نے ان (احادیث) کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لئے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔“

ہمارا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو احادیث سننے، ان کو حفظ کرنے اور ان کی کتابت و تحریر کرنے کی تاکید فرمائی اور ایسا کرنے والوں کے حق میں دعا فرمائی۔ اس طرح آپ ﷺ نے حفظ اور کتابت دونوں ذرائع سے کام لیتے ہوئے احادیث کی حفاظت اور ان کی تبلیغ و اشاعت کا اہتمام فرمایا۔

پھر چونکہ احادیث کا زیادہ حصہ عمل سے متعلق تھا۔ اس لئے ﴿أَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾ ”رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔“ کے قرآنی حکم کے مطابق صحابہ کرامؓ نے جیسے حضور ﷺ کو کوئی کام کرتے دیکھا، اُسے ویسے ہی کرنا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ نسل در نسل آگے چلتا گیا۔ اس طرح فعلی احادیث کا کثیر ذخیرہ عملی طور پر اُمت کو منتقل ہو گیا جو آج تک اُمتِ مسلمہ میں جاری و ساری ہے۔ حدیث کی حفاظت اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں نبی ﷺ کے چند ارشادات درج ذیل ہیں:

① سنن ابو داؤد (کتاب العلم) میں حضرت زید بن ثابتؓ سے مرفوع روایت ہے، وہ بیان

کرتے ہیں کہ

سمعت رسول اللہ ﷺ يقول: «نَصْرُ اللَّهِ امرءٌ سمع منا حديثاً فحفظه حتى يبلغه.....» (سنن ابوداؤد: ۳۶۶۰)

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ”اللہ اُس شخص کو تر و تازہ رکھے جو ہم سے حدیث سنے، پھر اُسے یاد اور محفوظ رکھے اور پھر اُسے دوسروں تک پہنچا دے.....“  
گویا اس حدیث میں نبی ﷺ نے ایسے ہر شخص کے حق میں دعا فرمائی ہے جو آپ سے حدیث سن کر اُسے یاد رکھے اور پھر دوسرے لوگوں تک پہنچائے۔

۲) اُسی طرح جامع ترمذی میں بھی حضرت زید بن ثابت انصاریؓ سے مرفوعاً مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ  
«نَصْرُ اللَّهِ امرءٌ سمع منا حديثاً فحفظه حتى يبلغه غيره.....»  
(جامع ترمذی: ۲۶۵۶)

”اللہ اُس آدمی کو تر و تازہ اور شاداب رکھے جس نے ہم سے کوئی حدیث سن کر یاد کر لی اور اُسے دوسرے تک پہنچا دیا.....“

۳) جامع ترمذی ہی میں ایک اور حدیث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ  
«نَصْرُ اللَّهِ امرءٌ سمع منا شيئاً فبلغه كما سمعه، فربّ مبلغ أوعى من سامع» (رقم الحدیث: ۲۶۵۷)

”اللہ تعالیٰ اُس شخص کو تر و تازہ رکھے جس نے مجھ سے کچھ سنا۔ پھر جیسے اُس نے سنا تھا ویسے ہی دوسروں تک اسے پہنچا دیا۔ ممکن ہے جسے بات پہنچائی جائے وہ پہلے سننے والے سے بھی زیادہ اُسے یاد رکھنے والا ہو۔“

۴) جامع ترمذی میں ایک اور روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«نَصْرُ اللَّهِ امرءٌ سمع مقالتي فوعاها وحفظها وبلغها.....» (رقم: ۲۶۵۸)  
”اللہ تعالیٰ اُس شخص کو تر و تازہ رکھے جس نے میری کوئی بات سنی، پھر اُسے یاد رکھ کر محفوظ کر لیا اور اُسے کسی اور تک پہنچا دیا۔“

اس کے علاوہ اسی مضمون کی احادیث حضرت معاذ بن جبل، حضرت جبیر بن مطعم اور حضرت ابو دردا رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں۔

⑤ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو شریح عدویؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فتح مکہ کے دوسرے روز ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں یہ بھی فرمایا کہ «ولیلغ الشاهد الغائب» (صحیح بخاری: ۱۰۴۰؛ صحیح مسلم: ۳۳۰۴) ”اور ضروری ہے کہ جو یہاں حاضر ہے، وہ اُس تک (میری باتیں) پہنچا دے جو یہاں حاضر نہیں ہے۔“

⑥ اسی طرح صحیح بخاری میں ہے کہ نبی ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: «فلیلغ الشاهد الغائب» (صحیح بخاری: ۱۷۴۱) ”پس لازم ہے کہ جو یہاں پر حاضر ہے، وہ اُس تک جو یہاں حاضر نہیں ہے، (میری باتیں) پہنچا دے۔“

نبی اکرم ﷺ کے مذکورہ ارشادات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو احادیث کی حفاظت اور ان کی تبلیغ و اشاعت کی تاکید فرمائی اور ایسا کرنے والوں کے حق میں بار بار دُعا بھی فرمائی۔

### صحابہ کرامؓ اور حفاظتِ حدیث

نبی ﷺ کے مذکورہ بالا ارشادات کی روشنی میں اور ان کے احکام کی تعمیل میں صحابہ کرامؓ نے احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ یاد کر لیا، اُسے لکھ کر محفوظ کیا، اس پر خود عمل کیا اور اسے دوسروں کو لوگوں تک پہنچا دیا۔

ذیل میں ہم چند مکشَرین (بکثرت روایت کرنے والے) صحابہ کرامؓ کے بارے میں بیان کریں گے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے ہزاروں احادیث سن کر یاد کر لیں اور پھر ان کو دوسروں تک پہنچایا:

① حضرت ابو ہریرہؓ نے ۵۳۷۷ حدیثیں حفظ کر کے اُمت تک منتقل کیں۔

② حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ۲۶۳۰ حدیثیں یاد کیں اور پھر ان کو اُمت تک پہنچایا۔

۳) حضرت انس بن مالکؓ نے ۲۲۸۶ حدیثیں زبانی یاد کر کے محفوظ کیں اور پھر ان کو اُمت کے حوالے کیا۔

۴) اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ نے ۲۲۱۰ حدیثیں یاد کرنے کے بعد دوسرے لوگوں تک پہنچائیں۔

۵) حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ۱۶۶۰ حدیثیں حفظ کرنے کے بعد اپنے شاگردوں تک منتقل کیں۔

۶) حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ نے ۱۵۴۰ حدیثیں یاد کیں اور دوسروں تک پہنچائیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے ایک مجموعہ بھی مرتب کیا۔

۷) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے نبی ﷺ کی طرف سے ۸۴۸ حدیثیں حفظ کیں اور ان کو دوسرے لوگوں تک پہنچایا۔

✽ جن صحابہ کرامؓ نے حدیثیں لکھیں اور ان کے مجموعے (صحیفے) مرتب کئے یا املا کرائے

اُن کی تعداد پچاس کے قریب ہے، ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱) حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کا صحیفہ جسے ”صحیفہ ابو زبیر“ بھی کہا جاتا ہے۔

۲) صحیفہ علی بن ابی طالبؓ

۳) صحیفہ سعد بن عبادہؓ

۴) صحیفہ عبداللہ بن عمرؓ

۵) صحیفہ جابر بن سمرہؓ

۶) صحیفہ زید بن ثابتؓ

۷) صحیفہ سہل بن سعد انصاریؓ

۸) صحیفہ براء بن عازبؓ

۹) صحیفہ ابو ہریرہؓ، جو صحیفہ ہمام بن منبہؓ کے نام سے مشہور ہے۔

یہ تفصیل جان لینے کے بعد بھی کیا کوئی معقول شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ”رسول اللہ ﷺ نے ان (احادیث) کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لئے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔“

**کیا اخبارِ آحاد دین کا حصہ نہیں؟**

غامدی صاحب پہلے تو یہ دعویٰ فرماتے ہیں کہ

”اس (حدیث) سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ کبھی علم یقین کے درجے کو نہیں پہنچتا۔“

اور پھر اس دعویٰ کی بنا پر خود ہی یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ

”اس کی بنا پر یہ ماننا تو ناگزیر ہے کہ اس سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا اضافہ نہیں ہوتا۔“

اب ہم پہلے ان کے دعوے پر گفتگو کریں گے اور آخر میں ان کے نکالے ہوئے نتیجے پر تبصرہ کریں گے۔

### کیا حدیث سے علم یقین حاصل نہیں ہوتا؟

حقیقت یہ ہے کہ اس بات پر تمام محدثین اور فقہائے اسلام کا اجماع اور اتفاق ہے کہ خبر متواتر، جو حدیث ہی کی ایک قسم ہے، اس سے علم یقین حاصل ہوتا ہے۔

غامدی صاحب جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حدیث سے علم یقین حاصل نہیں ہوتا تو وہ ایک ایسی بات کرتے ہیں جس کا اہل علم میں سے کوئی بھی قائل نہیں۔ باقی اب اجماعِ اُمت کے مقابلے میں تنہا غامدی صاحب کی رائے کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟

پھر اس بات پر تمام محدثین عظام اور فقہائے کرام کا اجماع اور اتفاق ہے کہ اخبارِ آحاد کا درجہ اگرچہ اخبارِ متواترہ سے کچھ کم ہے، تاہم جب وہ صحیح ہوں تو وہ بھی دین میں حجت اور دلیل ہوتی ہیں اور ان سے بھی ہر طرح کے شرعی احکام اخذ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی مسلمان اپنے وارث کے حق میں مالی وصیت نہیں کر سکتا اور نہ وہ ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کر سکتا ہے۔ یہ دونوں مسلمہ اجماعی شرعی احکام ہیں مگر یہ صرف اور صرف اخبارِ آحاد سے ثابت ہیں۔ اگر اخبارِ آحاد کو دین سے نکال دیا جائے تو پھر دین اسلام کے ۹۰ فیصد حصے کو بھی دین سے خارج کرنا پڑے گا اور اسلامی احکام و تعلیمات کو چھوڑنا پڑے گا۔

اور ہم یہ بات پورے حزم و احتیاط سے بیان کر رہے ہیں، ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اخبارِ آحاد ترک کرنے سے ہمیں پورا دین ترک کرنا پڑے گا اور اپنے ایمان سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے، کیونکہ ہمارا کلمہ اسلام (کلمہ طیبہ اور شہادتین) لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صرف اور صرف اخبارِ آحاد ہی سے ثابت ہے، ان کے سوا اس کلمے کا اثبات کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ یہ کلمہ نہ تو قرآن سے ثابت ہوتا ہے اور نہ غامدی صاحب کی بتائی ہوئی 'سنت' سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ جب کہ حال یہ ہے کہ اس کلمے کے اقرار ہی سے کوئی شخص دین کے دائرے میں داخل ہوتا اور اس کے انکار سے وہ دین کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ یہی کلمہ اسلام اور کفر میں امتیاز اور حد فاصل ہے۔ اسی کو پڑھنے سے آدمی مسلمان ہوتا



اور اسے چھوڑنے سے وہ کافر اور مرتد ہو جاتا ہے۔ یہ کلمہ ہمارے دین کی اساس ہے مگر اس کی بنا بھی صرف اخبارِ آحاد پر قائم ہے۔

خود قرآن مجید ہمیں اخبارِ آحاد کی بنیاد پر شرعی فیصلے کرنے کا مجاز قرار دیتا ہے۔ وہ ہمیں ایک، دو یا چار معتبر اور عادل (ذَوَا عَدَلٍ) مسلمانوں کی خبر پر یقین کرنے کا پابند کرتا ہے اور ان کی گواہی پر حدود جاری کرنے کا حکم دیتا ہے جس کے نتیجے میں شرعی طور پر کسی مجرم کا ہاتھ کاٹا جاسکتا ہے۔ کسی کو پھانسی پر چڑھا کر قتل کیا جاسکتا اور کسی کی پیٹھ پر کوڑے برسائے جاسکتے ہیں۔ پھر جب قرآن مجید نے اپنے نظامِ عدل و انصاف کی بنیاد غیر متواتر شہادتوں اور اخبارِ آحاد پر رکھی ہے تو قرآن کے مقابلے میں کوئی مسلمان یہ کہنے کی جسارت کیسے کر سکتا ہے کہ کسی حدیث کو حدیثِ رسول یا حکمِ رسول ماننے کے لئے تواتر کی شرط ضروری ہے اور یہ کہ ایک، دو یا چار معتبر اور عادل راویوں کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا کہ ان سے اُسے 'علم یقین' حاصل نہیں ہو پاتا۔ جب کہ اسلام میں صرف ایک معتبر اور عادل شخص (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) کی شہادت پر رویت ہلال ثابت ہو جاتی ہے جس کے بعد شرعی طور پر مسلمانوں کے لئے دوسرے دن روزہ رکھنا یا نہ رکھنا لازم ہو جاتا ہے۔

اخبارِ آحاد میں سے ایک متفق علیہ غریب حدیث ہے کہ «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ.....» ”اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔“ (صحیح بخاری: ۱) ہر مسلمان اس فرمانِ نبویؐ سے واقف ہے۔ اس حدیث کے صرف ایک ہی راوی حضرت عمر بن خطابؓ ہیں، لیکن ساری اُمت اسے صحیح اور درست مانتی ہے اور فقہائے اسلام اس سے مسائل کا استنباط کرتے اور استدلال میں پیش کرتے ہیں۔

افسوس کہ غامدی صاحب ایک طرف تو حدیث کی اخبارِ آحاد کے بارے میں تواتر کی شرط لگاتے ہیں اور اس کے پورا نہ ہونے کی صورت میں صحیح احادیث کو ناقابلِ اعتماد اور 'غیر یقینی' ٹھہرانے لگتے ہیں اور دوسری طرف اگر ان کو کوئی ضعیف بلکہ موضوع اور من گھڑت روایت بھی مل جائے جو ان کی خواہش اور ہوائے نفسانی کے مطابق ہو تو اُسے وہ بلا تامل مان لیتے اور اسے دلیل کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ درج ذیل حدیث بالاتفاق موضوع ہے کہ

”نبی ﷺ نے غزوہ تبوک سے واپسی کے موقع پر فرمایا تھا:  
«ارجعنا من الجہاد الأصغر إلی الجہاد الأكبر»

(السلسلة الضعيفة للألباني: ۲۴۶۰)

”ہم جہادِ اصغر (قتال فی سبیل اللہ) سے جہادِ اکبر (جہاد بالنفس) کی طرف واپس لوٹے ہیں۔“  
تو دیکھئے ایسی بے اصل اور موضوع روایت کو غامدی صاحب کس طرح مانتے ہیں، اس  
سے اُن کو ’علم یقین‘ بھی حاصل ہو جاتا ہے اور پھر اس سے استدلال بھی فرماتے ہیں۔ چنانچہ  
وہ لکھتے ہیں کہ

”اس امر میں کوئی شک نہیں کہ قرآن اور حدیث دونوں میں جہاد کا لفظ اپنے لغوی مفہوم میں  
بھی بکثرت استعمال ہوا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں دین کی دعوت و تبلیغ کا آغاز کیا تو  
اُسے بھی جہاد کہا گیا۔ آپؐ نے مدینہ میں سربراہ ریاست کی حیثیت سے یہود و نصاریٰ اور  
دوسرے مشرکین عرب کو دین کی دعوت پیش کی تو اسے بھی جہاد کا عنوان دیا۔ ایک غزوہ سے  
واپسی پر اپنے ساتھیوں کو عام زندگی میں تقویٰ اور راست روی کی روش اختیار کرنے کی  
نصیحت کی تو اسے ’قتال فی سبیل اللہ‘ کے مقابلے میں ’جہادِ اکبر‘ قرار دیا۔ چنانچہ ان معنوں میں  
دین کی سربلندی کے لئے کئے گئے کسی بھی کام کو ’جہاد‘ کہا گیا اور اس میں کوئی اختلاف  
نہیں ہے۔“ (ملاحظہ ہو: ماہنامہ ’اشراق‘ شمارہ دسمبر ۱۹۹۳ء، ص ۱۸)

یہ ہے غامدی صاحب کی احادیث کے بارے میں ’تحقیقِ انیق‘ اور ان پر تدبر کرنے کی  
اصل حقیقت، جس کا وہ ڈھنڈورا پیٹتے پھر رہے ہیں۔

اس مقام پر فارسی کا ایک قدیم شعر بہ ادنیٰ تصرف پیش کرنے کو جی چاہتا ہے، جس کا  
مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ ایسے باکمال ہوتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ گائے (کے بچھڑے) کو  
خدایمان لیتے ہیں مگر دوسری جانب نوح علیہ السلام کو نبی تسلیم نہیں کرتے۔

گاؤ را داری تو باور در خدائی، غامدی!

نوحؑ را باور نداری از پئے پیغمبری!

(جاری ہے)

\*\*\*\*\*

## دینی مقاصد کیلئے الیکٹرانک میڈیا کا استعمال

محدث کے تصویر نمبر کی اشاعت کے بعد بعض اہل علم نے اپنے موقف ارسال کئے۔ زیر نظر شمارہ میں اس نوعیت کے تین مضامین بالترتیب شائع کئے جا رہے ہیں، جن میں باہم متضاد موقف بھی اختیار کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ یہاں پیش کردہ بعض دلائل کا تصویر نمبر میں بھی جائزہ لیا جا چکا ہے۔ اس بحث میں جو اہل علم مزید حصہ لینا چاہیں، ان کے لئے ’محدث‘ کے صفحات حاضر ہیں۔ چند شماروں میں ان تکمیلی مضامین کی اشاعت کے بعد ان شاء اللہ ان پر ایک جامع تبصرہ پیش کیا جائے گا تاکہ قارئین انتشار فکری کی بجائے ایک واضح نتیجہ تک پہنچ سکیں۔

مدیر

مختلف اخبارات میں اے پی پی کے حوالہ سے خبر شائع ہوئی ہے کہ گزشتہ دنوں مکہ مکرمہ میں ’انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ‘ کے سربراہ حضرت مولانا عبدالحفیظ مکی کی زیر صدارت منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں تحفظ ختم نبوت کے حوالہ سے ٹی وی چینل کے اجرا کا اصولی فیصلہ کر لیا گیا ہے اور اس کے انتظامات کی تیاری ہو رہی ہے۔

دینی مقاصد کے لیے ٹی وی چینل کی ضرورت ایک عرصہ سے اس پس منظر میں محسوس کی جا رہی ہے کہ یہ آج کے دور میں ابلاغ کا سب سے مؤثر اور وسیع ذریعہ ہے اور مسلمانوں اور مغرب کے درمیان نظریاتی اور تہذیبی کشمکش میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مسلسل استعمال ہونے والا سب سے زیادہ مؤثر اور خوفناک ہتھیار ہے جس کے ذریعے اسلام کے عقائد و احکام کے خلاف نفرت انگیز مہم دن بدن وسیع ہوتی جا رہی ہے اور مسلمانوں بالخصوص دینی حلقوں کی کردار کشی کی جا رہی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہتھیار کا جواب ہتھیار سے ہی دیا جاسکتا ہے اور جنگ کا مسلمہ اصول ہے کہ دشمن کے پاس جو ہتھیار موجود ہو، اس سے زیادہ مؤثر ہتھیار حاصل کرنا یا کم از کم اس درجے کا ہتھیار مہیا کرنا ضروری ہوتا ہے، ورنہ مقابلہ مشکل ہو جاتا ہے۔

چند سال قبل ہم نے بھی 'ورلڈ اسلامک فورم' کے تحت اس کے لیے کوشش کی تھی کہ اسلام کی دعوت و تبلیغ اور تحفظ و دفاع کے لیے عالمی سطح پر کوئی ٹی وی چینل قائم کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ہم نے لندن میں متعدد سیمینار منعقد کیے اور مولانا محمد عیسیٰ منصوری، مولانا مفتی برکت اللہ اور راقم الحروف نے متعدد دیگر علمائے کرام کے ساتھ مل کر اس کے لیے لانگ کی، باقاعدہ اس کی فزٹیلٹی رپورٹ تیار کرائی اور مسلسل مہم چلائی، مگر ہم وسائل اور انتظامات کے تقاضے پورے نہ کر سکنے کی وجہ سے اس میں کامیاب نہ ہوئے، اس لیے اب اگر مولانا عبدالحفیظ مکی اور ان کے رفقا اس کی کوشش کر رہے ہیں تو ہمیں اس پر بے حد خوشی ہے اور ہم ان کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔ آمین یا رب العالمین!

جن دنوں ہم 'ورلڈ اسلامک فورم' کے تحت اس کے لیے کوشش کر رہے تھے تو بہت سے دوستوں نے ٹی وی کے جواز اور عدم جواز کے حوالہ سے سوال اٹھایا تھا مگر اس وقت ہم نے یہ عرض کیا کہ جہاں اجتماعی ضروریات کی بات ہو اور خاص طور پر حالت جنگ کا مرحلہ ہو تو ضروریات کا ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جہاں فقہائے کرام الضرورات تبیح المحظورات کے اصول کے تحت جواز اور عدم جواز سے چشم پوشی کر لیتے ہیں جس کی ایک واضح مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ اسلام نے جہاد و قتال اور جنگ کے جو اصول و ضوابط اور احکام و قواعد وضع کیے ہیں اور جناب نبی اکرم ﷺ نے اس سلسلہ میں جو واضح ہدایات دی ہیں، ان کی رو سے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کا کوئی جواز نہیں بنتا اور بلا تفریق پوری آبادی کو تہس نہس کر دینے والے یہ ہتھیار اسلام کے اصول جنگ سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتے، لیکن چونکہ یہ ہتھیار دشمن کے پاس موجود ہے اور ان سے بچاؤ کے لیے ہمارے پاس بھی اس قسم کے ہتھیاروں کی موجودگی ضروری ہے، اس لیے پوری دنیاے اسلام جواز اور عدم جواز کی بحث میں پڑے بغیر ایٹمی قوت کو بطور ہتھیار اختیار کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور کہیں سے بھی یہ آواز نہیں اُٹھ رہی کہ چونکہ ایٹمی ہتھیار اسلام کے اصول حرب اور جناب اکرم ﷺ کی ہدایات و تعلیمات کے معیار پر پورے نہیں اُترتے، اس لیے ان کے حصول کی کوشش ترک کر دی جائے بلکہ دینی حلقے عالم اسلام اور مسلم ممالک پر ایٹمی قوت بننے کے لیے زیادہ زور دے

رہے ہیں۔

اسی طرح اگر ٹی وی اسکرین کو بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سب سے زیادہ اور سب سے مؤثر طور پر استعمال ہونے والا ایک ہتھیار سمجھ لیا جائے تو میرے خیال میں جواز اور عدم جواز کی بحث کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، کیونکہ آج کے دور میں فقہائے کرام کے مسلمہ اُصول الضرورات تبیح المحظورات کے اطلاق کا اس سے زیادہ صحیح محل اور مصداق شاید اور کوئی معاملہ نہ ہو۔

مگر چونکہ ان دنوں علمی حلقوں میں ٹی وی اسکرین کے جواز اور عدم جواز کی بحث جاری ہے اور دونوں طرف سے اصحابِ علم اور اربابِ فتویٰ اس کے بارے میں اپنا اپنا موقف دلائل کے ساتھ پیش کر رہے ہیں، اس لیے ہم بھی اس حوالے سے چند طالبِ علمانہ گزارشات اہل علم کی خدمت میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں، اس اُمید پر کہ اصحابِ علم و دانش خالصتاً علمی بنیاد پر اور ملی ضروریات کے پیش نظر ان معروضات کا جائزہ لیں گے اور اس بحث کو کسی منطقی نتیجے تک پہنچانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں گے۔

ٹی وی اسکرین کے عدم جواز پر اصولی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ یہ تصویر ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ نے تصویر کو صراحئاً حرام قرار دیا ہے، اس لیے یہ بھی تصویر کے حکم میں ہے اور ناجائز ہے۔ یہاں دو باتوں پر غور ضروری ہے: ایک یہ کہ تصویر کا شرعی حکم کیا ہے؟ اور دوسری یہ کہ کیا ٹی وی اسکرین پر دیکھی جانے والی انسانوں کی نقل و حرکت واقعاً تصویر کے حکم میں ہے؟

① جہاں تک تصویر کا مسئلہ ہے، اس میں کوئی کلام نہیں کہ تصویر حرام ہے اور اُمت کے اہل علم کا کوئی طبقہ بھی اُصولی طور پر اس کے جواز کا قائل نہیں ہے، لیکن کیا تصویر کی اس کی حرمت کا اطلاق تصویر کی تمام صورتوں پر ہوتا ہے؟ اس میں بہر حال اختلاف موجود ہے اور یہ اختلاف حضراتِ صحابہ کرامؓ کے دور سے چلا آ رہا ہے۔

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت زید بن خالد جہنیؓ نے جناب نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد روایت کیا کہ جس گھر میں تصویر ہو، اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے، لیکن بسر بن سعیدؓ فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر حضرت زید بن خالد جہنیؓ بیمار ہوئے اور ہم ان کی عیادت کے لیے گئے تو

ان کے دروازے پر لٹکے ہوئے پردے پر تصویریں تھیں۔ میں نے وہاں موجود اُمّ المؤمنین حضرت میمونہؓ کے ربیب حضرت عبید اللہ سے دریافت کیا کہ حضرت زید بن خالد جہنی نے تو جناب نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہم سے یہ بیان کیا تھا، پھر یہ تصویروں والا پردہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ کیا تم نے حضرت زید بن خالدؓ سے مذکورہ ارشاد نبوی سنتے وقت یہ جملہ نہیں سنا تھا کہ اِلَّا الرِّقْمَ فِي الثُّوبِ یعنی وہ تصویر جو کپڑے میں نقش ہو، وہ ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔

اسی طرح ترمذی شریف میں روایت ہے کہ حضرت سہل بن سعد، حضرت ابوطحہ انصاری کی بیمار پرسی کے لیے گئے تو اُنہوں نے وہاں موجود ایک صاحب سے کہا کہ ان کے نیچے جو گدا بچھا ہوا ہے، اسے وہ نکال دے۔ حضرت سہلؓ نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ اس میں تصویریں ہیں۔ حضرت سہلؓ نے فرمایا کہ کیا جناب نبی اکرم ﷺ نے تصویر کی حرمت بیان کرتے ہوئے یہ نہیں فرمایا تھا کہ اِلَّا الرِّقْمَ فِي الثُّوبِ کہ کپڑے پر نقش تصویر اس سے مستثنیٰ ہے؟ تو حضرت ابوطحہ انصاریؓ نے کہا کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے یہ فرمایا تو تھا، مگر میں اپنے لیے زیادہ بہتر صورت پسند کرتا ہوں۔

بخاری شریف کی مذکورہ روایت کے حوالہ سے حاشیہ میں حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ نے اس سلسلہ میں مختلف فقہائے کرام کے اقوال و مذاہب نقل کیے ہیں اور قاضی ابن العربیؒ کا یہ تجزیہ بھی نقل کیا ہے کہ تصویروں کے بارے میں احکام کا خلاصہ یہ ہے کہ جسم رکھنے والی صورتیں یعنی مجسمے تو اُمت کے اجماع کی رو سے حرام ہیں، لیکن کپڑے یا کاغذ پر نقش تصویروں کے بارے میں فقہائے کرام کے چار اقوال ہیں:

ایک یہ کہ وہ بھی مطلقاً ممنوع ہیں، دوسرا یہ کہ مطلقاً جائز ہیں، تیسرا یہ کہ اگر تصویر کی ہیئت و شکل باقی ہے تو حرام ہے اور اگر اس کا سر کاٹ دیا گیا ہے اور اجزا الگ الگ کر دیے گئے ہیں تو جائز ہے اور چوتھا قول یہ ہے کہ اگر تصویر کو احترام کے ساتھ رکھا گیا ہے تو ناجائز ہے اور اگر اس کی تعظیم و تکریم نہیں ہوتی تو جائز ہے۔

قاضی ابن العربیؒ نے ان چاروں میں سے تیسرے قول کو ترجیح دی ہے کہ اگر تصویر کی شکل

وہیت تبدیل کر دی جائے تو جائز ہے، ورنہ نہیں لیکن مولانا احمد علی سہارنپوری موطا امام محمدؒ کے حوالے سے احناف کا موقف امام محمدؒ کے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

”ہم اس قول کو لیتے ہیں کہ اگر تصویر بستر پر یا چٹائی پر یا تکیے پر ہو جس کا احترام نہیں کیا جاتا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہاں جو تصویر سیدی کھڑی کی گئی ہو یا پردے پر لٹکی ہوئی ہو تو وہ مکروہ ہے۔ یہ قول حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ہے اور ہمارے یعنی احناف کے عام فقہاء کا قول بھی یہی ہے۔“

بخاری شریف کے حنفی شارح حضرت علامہ بدرالدین عینیؒ نے بھی ’عمدة القاری‘ میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام سفیان ثوریؒ اور امام ابراہیم نخعیؒ کا قول بھی یہی ہے۔

دلائل کی تفصیل میں جائے بغیر ہم نے یہ چند حوالے صرف اس نکتے کو واضح کرنے کے لیے پیش کیے ہیں کہ تصویر کی حرمت پر اصولی طور پر پوری اُمت کا اجماع و اتفاق موجود ہونے کے باوجود مختلف شکلوں پر اس کے اطلاق کے حوالے سے اختلاف صحابہ کرامؓ کے دور سے چلا آ رہا ہے اور یہ اختلاف دو حوالوں سے ہے:

- ۱۔ مابیت کے حوالے سے کہ کاغذ یا کپڑے پر نقش تصویر پر حرمت کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں؟
- ۲۔ مقصد کے حوالے سے کہ جو تصویر احترام کے پہلو سے خالی ہے اور اس کا ادب و احترام نہیں کیا جاتا، وہ حرمت میں شامل ہے یا نہیں؟

جب کہ اس سلسلہ میں احناف کا موقف یہ ہے کہ وہ ادب و حرمت کے پہلو سے فرق ملحوظ رکھتے ہیں اور جس تصویر میں ادب و حرمت کا پہلو نہیں پایا جاتا، وہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ فقہائے متقدمین کے درمیان پائے جانے والے اس واضح اختلاف کی موجودگی میں بھی اس معاملے میں اس قدر سختی کی کوئی گنجائش ہے کہ عدم جواز کے قول پر ’حرمت قطعاً‘ کا حکم صادر کر دیا جائے۔

② اس مسئلہ میں دوسرا پہلو یہ ہے کہ ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والی نقل و حرکت پر تصویر کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں؟ یہ ایک تکنیکی اور فنی بحث ہے اور بہر حال اجتہادی مسئلہ ہے جس میں

مفتیانِ کرام کے لیے دلائل اور مصالح کے حوالے سے دونوں طرف گنجائش موجود ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کم وبیش اسی طرح کی بحث ہے جیسا کہ نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کے جواز اور عدم جواز پر کم وبیش نصف صدی تک بحث جاری رہی ہے۔ لاؤڈ اسپیکر جب بنایا آیا تو ہمارے علمی حلقوں میں یہ بحث چل پڑی کہ اس کا نماز میں استعمال جائز ہے یا نہیں؟ اور جو مقتدی صرف لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر امام کی اقتدا کر رہا ہے، اس کی نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اس اختلاف کی بنیاد اس نکتہ پر تھی کہ لاؤڈ اسپیکر سے آنے والی آواز امام کی اصل آواز ہے یا اس کی صداے بازگشت ہے۔ اگر اصل آواز ہے تو نماز درست ہے اور اگر وہ اس سے مختلف نئی آواز ہے تو اس آواز پر امام کی اقتدا کرنے والے مقتدی کی نماز درست نہیں ہے۔

اب جن مفتیانِ کرام کی تحقیق یہ تھی کہ امام کی اصل آواز لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے بلند اور وسیع ہو کر سامعین تک پہنچ رہی ہے، ان کے نزدیک نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال جائز تھا اور جن کی تحقیق میں لاؤڈ اسپیکر کی آواز امام کی آواز سے مختلف تھی، وہ عدم جواز کا فتویٰ دیتے تھے۔

خود ہمارے ہاں مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں ہمارے بزرگ اور محترم اور مخدوم حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحبؒ عدم جواز کے قائل تھے اور جمعۃ المبارک کے اجتماع میں لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنے سے منع کیا کرتے تھے، لیکن ان کے نائب کے طور پر ۱۹۷۰ء میں جب میں یہاں آیا تو میں نے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ تک حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک درمیان کی راہ نکالی کہ وہ لاؤڈ اسپیکر کے ساتھ ساتھ دو تین مکبرین بھی کھڑے کر دیتے تھے، لیکن میرے خیال میں اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اس لیے رفتہ رفتہ وہ بھی ختم ہو گئی۔ ہمارے تبلیغی جماعت کے حضرات ابھی تک رائے ونڈ کے اجتماع میں نماز کے دوران لاؤڈ اسپیکر استعمال نہیں کرتے، لیکن عمومی طور پر اب کم وبیش ہر جگہ لاؤڈ اسپیکر کا نماز میں استعمال ہو رہا ہے۔

اس سلسلے میں ایک لطیفے کی بات ذکر کرنا بھی شاید مناسب نہ ہو کہ چند سال قبل مانسہرہ (ہزارہ) میں 'سائنس اور مذہب' کے حوالے سے ایک سیمینار ہوا جس کا اہتمام ہمارے فاضل دوست پروفیسر عبدالماجد صاحب نے کیا تھا جو مذہب اور سائنس کے درمیان ڈائلاگ کے



موضوع پر باقاعدہ ایک ادارہ قائم کر کے عالمی سطح پر کام کر رہے ہیں۔ اس سیمینار کی ایک نشست میں مجھے ’مہمان خصوصی‘ کا اعزاز بخشا گیا۔ اس موقع پر ایک نوجوان نے بڑے تند و تیز لہجے میں سوال کیا کہ مولوی صاحبان کا کیا ہے، وہ تو کل تک لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو بھی حرام کہتے رہے ہیں اور اب کوئی مولوی لاؤڈ اسپیکر کے بغیر نماز نہیں پڑھاتا۔

میں نے اس کے جواب میں عرض کیا کہ لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو کبھی کسی مولوی نے حرام قرار نہیں دیا، البتہ نماز میں اس کے استعمال میں اختلاف رہا ہے اور اس میں بھی مولوی صاحبان کا کوئی قصور نہیں ہے، اس لیے کہ مسئلہ تکنیکی نوعیت کا تھا جس کی وضاحت کے لیے علمائے کرام نے اصحاب فن سے رجوع کیا۔ اب جن اصحاب فن نے یہ بتایا کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز بولنے والے کی اصل آواز ہوتی ہے، ان کی تحقیق پر اعتماد کرتے ہوئے علمائے کرام کے ایک گروہ نے جواز کا فتویٰ دے دیا اور جن کو یہ بتایا گیا کہ اصل آواز نہیں ہوتی، انہوں نے عدم جواز کا فتویٰ دے دیا۔ اس لیے اختلاف تو اصحاب فن کا تھا جو مفتیان کرام کے فتوؤں میں اختلاف کا باعث بن گیا، اس میں مولوی صاحبان کا کیا قصور ہے؟

ٹی وی اسکرین کے بارے میں اختلاف بھی میری طالب علمانہ رائے میں اسی نوعیت کا ہے۔ جن اصحاب علم کی رائے یہ ہے کہ یہ تصویر ہے، ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک یہ حرام ہی ہوگی، لیکن جو حضرات اسے تصویر نہیں سمجھتے، وہ اس کے جواز کی بات کریں گے۔

ہم اس سلسلے میں زیادہ تفصیل میں جانے کی بجائے مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے چند فتاویٰ کا حوالہ دینا چاہیں گے جن کے نزدیک ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والی نقل و حرکت پر تصویر کا اطلاق نہیں ہوتا۔ کفایۃ المفتی جلد نہم میں تصویر اور اسکرین دونوں کے حوالے سے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے متعدد فتاویٰ موجود ہیں جن کا اہل علم کو ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہم ان میں سے تین چار کا ذکر کریں گے:

جہاں تک تصویر کا تعلق ہے، حضرت مفتی صاحبؒ کا موقف وہی ہے جو جمہور علما کا ہے، چنانچہ ایک فتوے میں وہ فرماتے ہیں کہ

”تصویر کھینچنا اور کھینچوانا ناجائز ہے، خواہ دستی ہو یا عکسی۔ دونوں تصویریں ہیں اور تصویر کا حکم

رکھتی ہیں۔ تصویر سے مراد جاندار کی تصویر ہے، خواہ انسان کی ہو، خواہ حیوان کی، البتہ مکانات کے نقشے اور درختوں کی تصویریں ناجائز نہیں ہیں۔“

جبکہ دوسرے فتوے میں تصویر کے بارے میں ان کا ارشاد یہ ہے کہ: ”تصویر بنانے کا حکم جداگانہ ہے اور تصویر رکھنے اور استعمال کرنے کا حکم جداگانہ ہے۔ تصویر بنانے اور بنوانے کا حکم تو یہ ہے کہ وہ مطلقاً حرام ہے، خواہ چھوٹی تصویر بنائی جائے یا بڑی، کیوں کہ علتِ ممانعت دونوں میں یکساں پائی جاتی ہے اور علتِ ممانعت مضاہاة لخلقِ اللہ ہے اور تصویر رکھنے اور استعمال کرنے کا حکم یہ ہے کہ اگر تصویر چھوٹی اور غیر مستبہن الاعضاء ہو تو اس کو ایسے طور پر رکھنا کہ تعظیم کا شبہ نہ ہو، جائز ہے یا ضرورت کے وقت استعمال کی جائے جیسے سکھ کی تصویر، تو جائز ہے۔ باقی بڑی تصویریں بلا ضرورت استعمال کرنا یا ایسی ضرورت میں رکھنا کہ تعظیم کا شبہ ہو، ناجائز ہے۔“

لیکن جب حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ سے سینما کی اسکرین کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے ایک جگہ یہ فرمایا کہ

”سینما اگر اخلاق سوز اور بے حیائی کے مناظر سے خالی ہو اور اس کے ساتھ گانا بجانا اور ناجائز امر نہ ہو تو فی حد ذاتہ مباح ہوگا، لیکن ہمارے علم میں کوئی فلم کسی نہ کسی ناجائز امر سے خالی نہیں ہوتی۔“

جب کہ ایک اور فتویٰ میں ان کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ ”سینما میں بہت سی باتیں غیر مشروع شامل ہو جاتی ہیں، مثلاً گانا بجانا، غیر محرم صورتیں، رقص، عریاں مناظر اور ان باتوں کی وجہ سے اس کی مجموعی کیفیت کہ لہو و لعب اور تہج شہواتِ نفسانیہ اس کا ادنیٰ نتیجہ ہے۔ ان وجوہ سے سینما دیکھنا ناجائز ہے، بعض صورتوں میں حرام اور بعض میں مکروہ ہے۔“

تصویر اور اسکرین دونوں کے بارے میں حضرت مفتی صاحبؒ کے ارشادات کا مطالعہ کیا جائے تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلتا کہ وہ تصویر اور اسکرین دونوں کو الگ الگ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسکرین پر تصویر کا اطلاق نہیں ہوتا اور اگر دیگر ممنوعہ امور سے خالی ہو تو اسکرین فی حد ذاتہ مباح، کا درجہ رکھتی ہے۔

ہماری ایک اور برگزیدہ علمی شخصیت اور جامعہ اشرفیہ لاہور کے سابق صدر مفتی حضرت

مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کا موقف بھی یہی ہے جیسا کہ ماہنامہ ”نور علی نور“ فیصل آباد نے شوال المکرم ۱۴۲۹ھ کے شمارے میں اس مسئلے میں حضرت مفتی صاحب کا ایک تفصیلی مضمون شائع کیا ہے جس کے آخر میں اس کے خلاصہ کے طور پر حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانویؒ خود یوں فرماتے ہیں کہ

”خلاصہ یہ ہے کہ ٹی وی اور وی سی آر آن آلات میں سے نہیں ہیں جو صرف لہو و لعب یا گانے بجانے اور کسی گناہ کے لیے بنائے گئے ہیں بلکہ ریڈیو، ٹیلی فون، تار کی طرح آواز اور شکلوں کو دور تک پہنچانے کے لیے ہیں، خواہ ان سے اچھے کاموں میں یہ کام لیا جائے یا برے کاموں میں، جائز میں یا ناجائز میں۔ ان کا حکم آلات لہو و لعب اور گانے کے آلات کا نہیں ہو سکتا کہ جس پر نیک کاموں کی بے حرمتی بنتی ہو۔ ان میں ہر مباح کام بھی جائز اور نیک کام بھی جائز ہے۔ قاعدہ فقہیہ یہ ہے کہ جس کے استعمالات بعض حلال، بعض حرام ہوں یا کچھ حلال اور بہت کچھ حرام بھی ہوں تو حلال صورت کی وجہ سے اس کا رکھنا، مرمت کرنا، خرید کرنا، فروخت کرنا سب جائز ہے۔ اسی قاعدہ سے خشخاش کی کاشت، افیون کی بناوٹ، ان کا خریدنا، فروخت کرنا اور بلائشہ کی دواؤں میں استعمال سب جائز ہوگا لیکن نشہ کی چیز کا استعمال حرام ہے اور باقی جائز ہے۔ ایسے ہی یہاں لہو و لعب، گانے بجانے اور سب ناجائز کام حرام و گناہ ہیں، باقی مباحات، طاعات اور عبادات سب جائز ہیں۔“

جبکہ اُستاذ العلماء حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کے بارے میں ان کے ایک شاگرد اور آزاد کشمیر کے معروف مفتی حضرت مولانا مفتی محمد رولیس خان صاحب آف میرپور نے ایک بار بتایا کہ حضرت کاندھلویؒ سے ٹی وی اسکرین کے بارے میں پوچھا گیا تو اُنھوں نے فرمایا کہ ”میاں! یہ چاقو ہے۔ اس سے خر بوزہ کاٹو گے تو جائز ہے اور کسی کا پیٹ پھاڑو گے تو ناجائز ہے۔“ اس کا مطلب واضح ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک سینما یا ٹی وی اسکرین کا حکم تصویر اور فوٹو سے مختلف ہے اور وہ اس کے جواز یا عدم جواز کی بات ماہیت کے حوالے سے نہیں، بلکہ مقاصد کے حوالے سے کرتے ہیں جیسا کہ خود تصویر کے بارے میں بھی حضرت امام محمدؒ کے بقول احناف کا ذوق یہی معلوم ہوتا ہے۔

اس لیے ہماری طالب علمانہ رائے میں اس قسم کے اجتہادی مسائل میں، جہاں

دونوں طرف گنجائش موجود ہو، زیادہ سختی سے کام نہیں لینا چاہیے اور دلائل کے ساتھ ساتھ ملی مصالح اور ضروریات کا لحاظ بھی رکھنا چاہیے۔ ہم نے ایک جگہ پڑھا تھا اور اپنے ایک مضمون میں اس کا حوالہ بھی دیا تھا کہ مزارعت (یعنی بٹائی پر زمین کاشت کے لیے دینا) کو حضرت امام ابوحنیفہؒ ناجائز کہتے ہیں اور صاحبین یعنی حضرت امام ابو یوسف اور امام محمدؒ اس کے جواز کے قائل ہیں۔ اس پر معروف حنفی محدث و فقیہ حضرت ملا علی قاریؒ نے دونوں طرف کے دلائل کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے فرمایا تھا کہ دلائل کے حوالے سے حضرت امام صاحبؒ کا موقف قومی ہے، لیکن چونکہ مصلحت عامہ صاحبین کے قول میں ہے، اس لیے فتویٰ صاحبین کے قول پر دیا جاتا ہے۔

اسکرین کے مسئلہ پر ہمارے خیال میں مصلحت عامہ کا تعلق دونوں طرف ہے۔ ایک جانب عام مسلمانوں کو بے حیائی، عریانی، گانے بجانے اور فحاشی کے ماحول سے بچانے کا جذبہ ہے اور مسلم معاشرہ میں دینی ماحول کا تحفظ مقصود ہے جو ظاہر ہے کہ بہت مبارک جذبہ ہے اور مفتیانِ کرام کی دینی ذمہ داریوں میں سے ہے، لیکن دوسری طرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ٹی وی چینلز کے ذریعے پھیلائے جانے والے شکوک و شبہات کا ازالہ، اسلامی عقائد اور احکام کا دفاع اور مسلمانوں کے عقائد و نظریات کا تحفظ بنیادی ہدف ہے اور یہ بھی ہماری ملی اور دینی ضروریات میں سے ہے۔ عام مسلمانوں کی مصلحت و مفاد کا تعلق دونوں طرف ہے اور دلائل بھی یقیناً دونوں طرف موجود ہیں، اس لیے دلائل اور ترجیحات کی بحث میں پڑے بغیر ہم اربابِ دانش اور اصحابِ فتویٰ سے یہ گزارش کرنا چاہیں گے کہ وہ دونوں طرف سے دلائل اور مصالح عامہ کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی ایسا متوازن اور باوقار راستہ نکالنے کے لیے اپنی اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں کہ ”سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“ یہ آج کے دور میں ہمارے اربابِ علم و فضل کی اجتہادی صلاحیت و بصیرت کا امتحان ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ ہمیشہ کی طرح ہمارے آج کے مفتیانِ کرام بھی اُمت کی علمی و فکری راہنمائی کا کوئی متوازن اور عملی راستہ نکالنے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ ان شاء اللہ!

محمد اقبال کیلانی

مباحثہ علمیہ

الریاض، سعودی عرب

## دینی مقاصد کے لیے ٹی وی پروگراموں میں شرکت

محدث کے ’تصویر نمبر‘ پر ایک دوسرے موقف کی ترجمانی کرتے ہوئے ’سلسلہ تفہیم السنہ‘ کے فاضل مصنف مولانا اقبال کیلانی نے اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے اور علمائے کرام سے اپنے فتویٰ پر نظر ثانی کی درخواست کی ہے۔ اس سلسلے میں مزید مضامین اور بحث و ردود کا سلسلہ ’محدث‘ میں جاری ہے جس کے لئے ادارہ محدث نے بعض دیگر اہل علم سے بھی اس موضوع پر لکھنے کی درخواست کی ہے۔ اتباع کتاب و سنت کے مخلصانہ جذبہ کی حامل یہ تحریر نذر قارئین ہے، جس سے انہیں اس کا دوسرا رخ جاننے کا بھی موقع حاصل ہوگا۔ اس بحث کی سابقہ تحریریں جون کے علاوہ اگست ۲۰۰۸ء کے شمارہ میں بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ مدیر

جون ۲۰۰۸ء کے ماہنامہ ’محدث‘ لاہور میں ’ملیٰ مجلس شرعی‘ کے مذاکرہ علمیہ کی روداد شائع ہوئی ہے جس میں مختلف مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے پندرہ واجب الاحترام علمائے کرام نے یہ فتویٰ صادر فرمایا ہے کہ

”دعوت و اصلاح اور اسلامی مقاصد کے حصول خصوصاً اسلام کے دفاع اور دین مخالف پروپیگنڈہ کا جواب دینے کے لیے الیکٹرانک میڈیا کا استعمال جائز ہے، خواہ بہ اکراہ ہی کیوں نہ ہو۔“

امید تھی کہ اس موضوع پر دیگر علمائے کرام بھی اظہار خیال فرمائیں گے لیکن حیرت کی بات ہے کہ چار پانچ ماہ کا عرصہ گزرنے کے باوجود کم از کم میری نظر سے ایسا کوئی مضمون نہیں گزرا جس میں اس فتویٰ سے اختلاف کیا گیا ہو۔ کم و بیش پانچ ماہ بعد ہفت روزہ ’الاعتصام‘ لاہور نے ۱۰ تا ۱۶ اکتوبر ۲۰۰۸ء کے شمارہ میں محترم حافظ صلاح الدین یوسف صاحب حفظہ اللہ کا ’محدث‘ میں مطبوعہ مضمون دوبارہ شائع کیا ہے، کیا اس سے یہ تاثر لیا جائے کہ پاکستان کے تمام علمائے کرام اس فتویٰ سے متفق ہیں؟ علمائے کرام کے کسی متفقہ فیصلے سے اختلاف کرنا مجھ جیسے کم علم طالب علم کے لیے نہ صرف مشکل بلکہ طبیعت کے لیے ناگزیر بھی ہے لیکن یہ موضوع اپنے

نتائج کے اعتبار سے اس قدر اہم اور حساس ہے کہ اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ لینا از بس ضروری ہے۔

جہاں تک تصویر کی حرمت کا تعلق ہے، احادیثِ مبارکہ میں بیان کی گئی شدید وعید کے پیش نظر بے غبار اور قابلِ اطمینان بات یہی ہے کہ تصویر ہاتھ سے بنائی گئی ہو یا کیمرے سے، ویڈیو کی ہو یا ٹی وی کی، پردہ سکرین پر ہو یا کاغذ پر، متحرک ہو یا غیر متحرک۔ قطعی طور پر حرام ہے۔ مذاکرہ علمیہ میں شریک تمام علمائے کرام نے اتفاق رائے سے دینی پروگراموں کے لیے ٹی وی پر آنے کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض علمائے کرام نے برضا و رغبت اور بعض نے اسے بکراہت جائز قرار دیا ہے، دونوں صورتوں میں نتیجہ بہر حال ایک ہی ہے۔

مذاکرہ علمیہ میں شریک واجب الاحترام علمائے کرام کو ہم تین گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

① وہ گروہ جو پہلے سے ہی اس فتویٰ پر عمل کر رہا ہے مثلاً جماعت اسلامی اور دیگر دینی جماعتوں کے بعض علمائے کرام۔

② وہ گروہ جس نے مذاکرہ میں برضا و رغبت ٹی وی پروگراموں میں شرکت کا اظہار فرمایا۔

③ وہ گروہ جس نے بکراہت ٹی وی پروگراموں میں شرکت کو جائز قرار دیا۔

پہلے دونوں گروہوں کا معاملہ تو ایک جیسا ہے جن کے موقف کی ہم کسی صورت میں تائید نہیں کر سکتے، البتہ تیسرے گروہ کے دلائل کا تجزیہ پیش خدمت ہے:

① ٹی وی پروگراموں میں بکراہت شرکت کرنے والے علمائے کرام اصلاً اس بات سے متفق ہیں کہ یہ شرکت عام حالات میں جائز نہیں، البتہ جب اضطراری کیفیت پیدا ہو جائے تو بکراہت ایسا کرنا جائز ہے۔ یہ جواز قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ سے پیدا کیا گیا ہے:

﴿فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ﴾ (البقرة: ۱۷۳)

اس آیت کریمہ میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے خنزیر یا حرام چیز کھانے کی اجازت بعض شرائط کے ساتھ دی ہے:

**اَوَّلًا:** حلال چیز میسر نہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ وطن عزیز میں علمائے کرام پر دعوت اور تبلیغ کے تمام جائز راستے بند ہو چکے ہیں؟ اگر ایسا نہیں (اور واقعی نہیں) تو پھر اس آیت مبارکہ سے

اضطرار کا جواز کیسے پیدا کیا جاسکتا ہے؟

**ثانیاً:** حلال چیز میسر نہ ہونے کی وجہ سے جان کا خطرہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک فرد کی مثال کو پوری قوم یا ملک پر منطبق کرنا کسی طرح بھی درست معلوم نہیں ہوتا، کجا یہ کہ پوری دنیا میں مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ملتِ اسلامیہ پر اسے منطبق کیا جائے۔ اگر یہ درست بھی ہو تو غور طلب بات یہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی تعلیمات اور اسلامی اقدار کے پریشان کن تنزل اور انحطاط کے باوجود کیا واقعی پاکستان سے اسلام کے مکمل طور پر ختم ہونے اور مٹنے کے آثار موجود ہیں؟ چلئے لمحہ بھر کے لئے مان لیجئے کہ پاکستان سے مکمل طور پر اسلام کے مٹنے کے آثار موجود ہیں (لا قدرِ اللہ ابدًا)..... تو پھر بھی کیا پاکستان سے اسلام کا وجود ختم ہونے کے ساتھ ہی پوری دنیا سے اسلام کا وجود مٹ جائے گا؟ کیا ہسپانیہ سے اسلام کے ختم ہونے کے ساتھ اسلام ساری دنیا سے ختم ہو گیا؟ ہرگز نہیں، تو پھر کیا پاکستان میں موجودہ صورتِ حال کو اضطراری قرار دینا واقعی درست ہوگا؟

**ثالثاً:** حرام چیز کا استعمال بقدرِ ضرورت ہو۔ گویا اضطراری حالت میں بھی حرام کو حلال کرنے کی اجازت بالکل محدود اور عارضی ہے، غیر محدود اور مستقل نہیں۔ کیا ٹی وی پر بکراہت آنے کی اجازت دینے والے واجب الاحترام علمائے کرام نے اس عارضی مدت کا تعین فرما لیا ہے جس میں وہ قوم کی اصلاح کر لیں گے۔ اسلام کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈہ کا تدارک کر لیں گے اور اس کے بعد ٹی وی پر آنا بند کر دیں گے۔

سچی بات یہ ہے کہ فرد کے اضطرار کو پوری قوم کے اضطرار پر قیاس کر کے حرام چیز کو مستقل حلال کرنے کا اجتہاد ہماری سمجھ سے بالکل ہی بالاتر ہے۔

۲ ٹی وی پر بکراہت آنے کے حق میں سورۃ النحل کی آیت نمبر ۱۰۶ کا حوالہ بھی دیا گیا ہے جس میں ایمان پر مطمئن رہتے ہوئے کلمہ کفر کہنے کی رخصت دی گئی ہے۔ یہاں بھی جان بچانے کے لئے عارضی طور پر کلمہ کفر کہنے کی اجازت ہے۔ کیا اس آیتِ کریمہ سے واقعی ایک حرام چیز کو مستقل حلال کر لینے کا جواز پیدا ہوتا ہے جبکہ جاں کے خطرے کا پہلو بھی محلِ نظر ہو؟

۳ اضطرابی کیفیت کے سلسلہ میں شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور دیگر سرکاری دستاویزات پر تصاویر کی مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ ہماری ناقص رائے میں ان مثالوں سے اضطراب کا جواز اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ اولاً یہ تصویریں بنوانے کے لیے قانون کا اس قدر جبر موجود ہے کہ ان کے بغیر کسی بھی انسان کا کاروبار زندگی چلانا ممکن نہیں۔ ثانیاً اس مسئلہ کو کوئی دوسرا متبادل حل بھی نہیں، لہذا فرد اس 'جرم' سے بری الذمہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ٹی وی پر آنے والے علمائے کرام پر واقعی کوئی ایسا جبر موجود ہے کہ ٹی وی پر آئے بغیر ان کے لیے دعوت کا کام ناممکن ہو گیا ہو یا پھر اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی دوسرا متبادل نہ ہو؟

۴ ایک بڑی پُرکشش اور دل فریب دلیل یہ بھی دی گئی ہے: ”کیا صرف تصویر کی حرمت کی خاطر پوری قوم کو لادین عناصر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے؟“..... ”بدکاری، فحاشی اور عریانی کی دعوت کے جواب میں علماء اس لیے خاموش بیٹھے رہیں کہ تصویر حرام ہے؟“..... ”توپ کا مقابلہ تلوار سے اور کلاشکوف کا مقابلہ میزائل سے ممکن نہیں لہذا نئی نسل کو لادینیت کی یلغار سے بچانے کے لیے جدید ذرائع کا استعمال ضروری ہے۔“ وغیرہ وغیرہ

ہمارے واجب الاحترام علمائے کرام نے یہ دلیل اس وثوق اور پُر زور طریقے سے دی ہے گویا ۱۶ کروڑ عوام کا قبلہ درست ہونے میں اگر کسی چیز کی کمی ہے تو وہ صرف علمائے کرام کے ٹی وی پر آنے کی ہے۔ جیسے ہی علمائے کرام ٹی وی پر قدم رنجہ فرمائیں گے، پاکستان صحیح معنوں میں اسلامی جمہوریہ پاکستان بن جائے گا۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے ٹی وی پروگراموں میں علمائے کرام کی شرکت سے حالات کی اصلاح کا نتیجہ تو قطعاً غیر یقینی ہے۔ البتہ حرام کو حلال کرنے کا گناہ سو فیصد یقینی ہے یعنی اِثمہا اکبر من نفعہا!

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بعض الفاظ اور فقرات واقعی جادو کا سا اثر رکھتے ہیں، مخاطب پر اثر انداز ہونے کی اپنے اندر بے پناہ قوت رکھتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ عملی زندگی میں ان کے نتائج بھی ویسے ہی خوبصورت اور خوش نما ہوں۔

آج سے کم و بیش نصف صدی قبل دینی جماعتوں نے ایسے ہی پُرکشش اور خوبصورت



دلائل کی بنا پر سیاست کے میدانِ خارزار میں قدم رکھا۔ سیاست میں بعض دینی جماعتوں اور بعض علمائے کرام کے مثبت کردار سے ہمیں انکار نہیں لیکن مجموعی طور پر غور فرمائیے کہ گذشتہ نصف صدی سے دینی جماعتوں اور واجب الاحترام علمائے کرام کی میدانِ سیاست میں موجودگی کے باوجود سیاست کی غلاظت اور گندگی میں اضافہ ہوا یا کمی آئی ہے؟

اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ علمائے کرام کے میدانِ سیاست میں آنے کے بعد علمائے کرام کی عزت اور وقار میں اضافہ ہوا ہے یا کمی آئی ہے؟ معاشرے میں علمائے کرام کی عزت اور وقار میں اضافہ درحقیقت اسلام کی دعوت اور اشاعت میں اضافہ کا باعث ہے اور علمائے کرام کی عزت اور وقار میں کمی اسلام کی دعوت اور اشاعت میں کمی کا باعث ہے، لہذا اس پہلو کو بھی کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

توپ کا مقابلہ توپ سے، کلاشنکوف کا کلاشنکوف اور میزائل کا میزائل سے اور ٹی وی کا گند ٹی وی سے صاف کرنے کی دلیل کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جب افغانستان پر امریکی حملہ کے وقت پاکستان نے امریکہ کو تمام سہولتیں دینے کے لئے گھٹنے ٹیک دیئے تو امریکہ نواز دانشوروں نے یہ کہہ کر حکومت کی تائید کی کہ ہم امریکہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے پہلے ہمیں ویسی ٹیکنالوجی اور اسلحہ تیار کرنا چاہیے، پھر مقابلہ کرنا چاہیے۔ تب ہمارے واجب الاحترام علمائے کرام نے غزوہ بدر سے لے کر جہادِ افغانستان تک کی تاریخ سے اس بات کے حق میں دلائل کے انبار لگا دیئے کہ حق و باطل کی جنگ میں اسلحہ اور ساز و سامان نہیں، جذبہ ایمان اہم ہوتا ہے.....

لیکن ٹی وی کے معاملے میں اب علمائے کرام خود یہ فرما رہے ہیں کہ میزائل کا مقابلہ کلاشنکوف سے اور توپ کا مقابلہ تلوار سے ممکن نہیں۔ ٹی وی سے پھیلائی جانے والی غلاظت کی صفائی ٹی وی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ وطن عزیز کے جید علمائے کرام کے اس 'یوٹرن' کو کون سا نام دیا جائے؟

۵ مذاکرہ علمیہ میں سعودی عرب کی فتویٰ کونسل کے ایک فتویٰ کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس

کے الفاظ یہ ہیں: ”ٹی وی پر گانے، موسیقی اور تصویر جیسی منکرات حرام ہیں لیکن اسلامی کچھر، تجارتی اور سیاسی خبریں جن کی شریعت میں ممانعت وارد نہیں، جائز ہیں۔“

بلاشبہ اس فتویٰ سے ٹی وی پر دینی پروگراموں میں شرکت کی تائید ہوتی ہے لیکن ہماری گزارش یہ ہے کہ اس فتویٰ کے بعد اس پر عمل درآمد کی صورتِ حال کا بھی جائزہ لیا جائے۔ دائمی فتویٰ کونسل کا یہ فتویٰ ۱۴۱۱ ہجری میں شائع ہوا، اب ۱۴۲۹ ہجری کا اختتام ہے۔ ممکن ہے ۱۴۱۱ ہجری میں ٹی وی پر صرف اسلامی لیکچر، تجارتی اور سیاسی خبریں ہی دی جاتی رہی ہوں لیکن اٹھارہ سال بعد آج کی صورتِ حال کیا ہمارے علمائے کرام کی نظروں سے مخفی ہے؟ آج کل جو کچھ ٹی وی پر آ رہا ہے، وہ ہے تو بہر حال اسی فتویٰ کا مرہونِ منت۔

دوسری مثال اپنے گھر کی لے لیجیے: وطن عزیز پاکستان میں جماعتِ اسلامی، ’ملیٰ مجلس شرعی‘ کے قیام سے پہلے ہی بقول محترم مولانا عبدالملک صاحب، الیکٹرانک میڈیا میں حصہ لینے کو جائز قرار دے چکی ہے۔ ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ جماعتِ اسلامی کے واجب الاحترام علمائے کرام نے کتنی مدت پہلے یہ فیصلہ فرمایا تھا لیکن آج کی صورتِ حال یہ ہے کہ جماعت کے روزنامہ ’جسارت‘ کی اشاعتِ خاص بسلسلہ اجتماع عام ۲۴ تا ۲۶ اکتوبر ۲۰۰۸ء کے صفحہ ۳۲ پر ’عرق مہزل لاثانی‘ اور ’گیسٹو وینا سیرپ لاثانی‘ نیز صفحہ ۶۸ پر ’وگورین چلڈرن سیرپ‘ کی تشہیر کے لئے روایتی ماڈل گرلز کی بے حجاب تصویریں موجود ہیں۔ یہ تصویریں برضا و رغبت ٹی وی پر آنے کی اجازت دینے کے فیصلہ کی مرہونِ منت نہیں تو اور کیا ہیں؟

کیا عمل بالحدیث کا دعویٰ رکھنے والے علمائے کرام اپنے ہاں بھی ایسی افسوسناک صورت حال دیکھنا پسند فرمائیں گے؟

کوئی فیصلہ کرتے وقت ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ بند دروازہ کھولنا بہت آسان ہے، لیکن اسے مزید کھلنے نہ دینا یا اسے دوبارہ بند کرنا کہیں زیادہ مشکل ہے۔

❶ خیر و شر کی بحث میں بکثرت دی جانے والی مثال کا حوالہ بھی مذاکرہ میں دیا گیا کہ ٹی وی تو محض ایک آلہ ہے، اس سے خیر اور شر دونوں کا کام لیا جاسکتا ہے۔ لہذا اس سے خیر کا کام

لینے میں کیا حرج ہے؟

ٹی وی کے بارے میں اولاً تو ہمیں یہ تسلیم کرنے میں ہی تامل ہے کہ یہ خیر و شر کا آلہ ہے۔ اس میں اگر کوئی خیر کی بات ہے تو اتنی ہی ہے جتنی شراب، جوا، سود، رشوت، بے ججائی اور موسیقی وغیرہ میں ہے۔ ثانیاً، لمحہ بھر کے لئے ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ ٹی وی خیر و شر دونوں کا آلہ ہے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ علمائے کرام نے ٹی وی کے 'خیر' کے پہلوؤں پر تو گفتگو فرمائی ہے مگر اس کے شر کے پہلوؤں پر گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی، حالانکہ بیلنس شیٹ تو منفی مثبت دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر تیار ہونی چاہیے۔

بلاشبہ محترم حافظ صلاح الدین یوسف صاحب نے ٹی وی کے شر کے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش فرمائی جو بالکل درست اور قابل تحسین تھی لیکن افسوس، محترم حافظ صاحب نے آخر میں بہ کراہت ٹی وی پر آنے کی اجازت دے کر اپنے ہی دلائل پر خطِ تنسیخ پھیر دیا۔ کاش وہ ایسا نہ فرماتے!

آخر میں ہم واجب الاحترام علمائے کرام کی خدمت میں چند سوالات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری درخواست ہے کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ان پر بھی غور فرمالیا جائے:

۱۔ عہد نبویؐ میں نصر بن حارث نے اسلام کا راستہ روکنے کے لیے ٹی وی کلچر (گانا بجانا، فحاشی اور بے حیائی) کا آغاز کیا تو رسول اکرم ﷺ نے اس کا توڑ کیسے فرمایا؟

۲۔ تبلیغی جماعت سے بعض اختلافات کے باوجود کسی پرنٹ میڈیا یا الیکٹرانک میڈیا کے استعمال کے بغیر حیران کن حد تک، اعلیٰ تعلیم یافتہ، متوسط تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ؛ تینوں طبقوں میں پوری دنیا کے ممالک میں منظم ترین دعوت اور تبلیغ کے کام میں ہمارے لیے کوئی سبق ہے یا نہیں؟

۔ سب کچھ اور ہے جسے تو سمجھتا ہے

زوال بندہ مؤمن کا بے زری سے نہیں

۳۔ چند سال قبل ایک فلم 'خدا کے لیے' بنائی گئی جس میں حجاب، داڑھی، عورتوں کے حقوق، مرتد

کی سزا، قانون حدود اور بعض دیگر اسلامی احکام کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ علمائے کرام کو بطور خاص نشانہ تضحیک بنایا گیا ہے۔ کیا نظریہ ضرورت کے تحت اس کا توڑ کرنے کے لئے فلم بنانے کی اجازت بھی دے دی جائے گی؟ فنی اعتبار سے فلم اور ویڈیو میں ویسے بھی کچھ فرق نہیں۔

۴۔ ٹی وی پر فحاشی، عریانی، بے حیائی اور اسلامی اقدار کی تضحیک بلاشبہ کبائر میں سے ہے لیکن اکبر الکبائر تو شرک ہے جسے ٹی وی دیگر کبائر کی طرح دن رات بڑی تیزی سے پھیلا رہا ہے۔ کیا ’ملیٰ مجلس شرعی‘ کے واجب الاحترام علمائے کرام ٹی وی پر قبر پرستی اور شرک کے خلاف بھی آواز اٹھانا پسند فرمائیں گے یا نہیں؟

ہماری گزارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ ملیٰ مجلس شرعی کے واجب الاحترام علمائے کرام کو اپنے فتویٰ پر نظر ثانی کرنی چاہے تاکہ موہوم امیدوں کے حصول میں کتاب و سنت کے واضح احکام پامال نہ ہو۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

”مریض کا علاج حرام دوا سے نہ کرو۔“ (مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ)

کم از کم جو علمائے کرام تصویر کو ہر صورت میں حرام سمجھتے ہیں، انہیں تو یہ ’دوا‘ ’مریض‘ کے لئے تجویز کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ ویسے بھی انسان اللہ تعالیٰ کے ہاں سعی اور جدوجہد کا مکلف ہے، نتائج کا نہیں تو پھر حدود اللہ کو پامال کیوں کیا جائے؟

عمل بالحدیث کی فکر رکھنے والے واجب الاحترام علمائے کرام سے ہماری خاص طور پر مؤدبانہ گزارش ہے کہ انہیں

**اولاً:** اپنی کراہت کا اظہار ٹی وی پروگراموں میں شریک ہو کر نہیں بلکہ شریک نہ ہو کر کرنا چاہیے۔

**ثانیاً:** کتاب و سنت کے چشمہ صافی کو ہر طرح کی آمیزشوں اور آلائشوں سے پاک صاف رکھنا اور آنے والی نسلوں تک اسے من و عن پھیلانا آپ کا مشن ہے، اس میں کوئی کوتاہی اور لغزش نہ ہونے پائے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے علمائے کرام کو سیاست کی دلدل میں پھنسنے کے بعد اب ٹی وی کے فتنے سے محفوظ رکھے۔ آمین! و صلی اللہ علی نبینا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

## جب تصویر کی آفت نہ تھی!

علم قیافہ و فراست کا عجیب واقعہ

ہادیٰ برحق جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے بنی نوع انسان کی دنیا و آخرت میں کامیابی کے لیے جو شرعی، اخلاقی اور معاشرتی اصول و ضوابط پیش فرمائے ہیں، انہیں ’عقل عیار‘ پر پرکھ کر بے قیمت بنا دینا بہت بڑی ضلالت اور گھاٹے کا سودا ہے۔ لوگ اس راہ اور اس ضابطہ سے اعراض کر کے کسی صورت بھی امن و سکون نہیں پاسکتے، خواہ مادی اعتبار سے کتنا ہی مال کیوں نہ جمع کر لیں، یا اسلحہ کے زور پر قوموں کو فتح کر لیں یا فکری اعتبار سے کیسے ہی فلسفے بھگا لیں! ان تعلیمات میں سے ایک ارشاد آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تصویر کے بارے میں ہے کہ ہر ذی روح شے کی تصویر سے آپ نے صراحت کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ جس جگہ میں تصویر ہو، وہاں رحمت کا فرشتہ نہیں آتا۔ یہ کسب اور کاروبار لعنت کا کام ہے۔

ان شرعی احکام و مسائل پر عمل پیرا ہونا اُن بندوں کے لیے بے حد آسان ہے جن میں اپنے اللہ کے رب ہونے، محمد (ﷺ) کے نبی اور رسول ہونے اور اسلام کے دین حق ہونے کا یقین ہو۔ اور یہ کہ فرشتے بھی کوئی چیز ہیں، ان کی اپنی اہمیت ہے اور ہمیں ضرورت ہے کہ وہ ہم پر، ہمارے گھروں اور دکانوں میں نازل ہوں اور اگر خدا نخواستہ ایمان کی یہ بنیاد کمزور ہو تو پھر حیلے بہانے سے ان تعلیمات کو ’روشن خیالی‘ سے منور کرنے کی سوراہیں نکل آتی ہیں۔ و نسأل اللہ العافیۃ..... اور پھر منہنی نتائج کی ذمہ داری سو فیصد ہم حیلہ باز لوگوں ہی پر ہے۔ اللہ تعالیٰ تو کسی طرح بھی ظالم نہیں!!

تصویر کے بارے میں امام بخاریؒ نے صحیح بخاری کی کتاب اللباس میں پورے دس باب ذکر کئے ہیں<sup>①</sup> معلوم کیا جانا چاہئے کہ تصویر کی ضرورت کے اسباب جو آج ہماری زندگی میں داخل ہو گئے ہیں یا کر دیئے گئے ہیں، کیا کل ماضی میں نہ تھے؟ قانون اور معاشرتی ضروریات یقیناً پہلے بھی ایسی ہی تھیں تو لوگ اپنی یہ ضروریات کس طرح پوری کرتے تھے جبکہ تصویر نہ تھی؟

☆ صدر مدرس جامعہ مراۃ القرآن والحديث، منڈی وار برٹن، شیخوپورہ، سابق مدیر التعليم جامعہ ابی بکر، کراچی

ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ وہ لوگ 'علم قیافہ اور علم فراست' سے اپنی یہ ضروریات پوری کرتے تھے۔ اور تصویر کے مقابلہ میں کہیں عملی طور پر یہ چیزیں ان کے مقاصد پورا کرتیں۔

جب سے لوگوں نے اور بالخصوص مسلمانوں نے شرعی حقائق سے اعراض کیا اور تصویر کی برائی کو بڑی برائی کے مقابلہ میں چھوٹی برائی..... اھون البلیتین..... کے طور پر ہنہٹا مریٹا بنا لیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی علم فراست کو ان میں سے اٹھا لیا۔ درج ذیل واقعہ میں جو صحیح بخاری کی کتاب المغازی میں باب قتل حمزہ بن عبد المطلب<sup>①</sup> میں آیا ہے بڑا حیرت انگیز ہے کہ لوگ فطری طور پر کس قدر زیرک، دانا اور صاحب فراست ہوتے تھے۔

حضرت معاویہؓ کے دور کا واقعہ ہے کہ جعفر بن عمر و ضمری اور قبیلہ بنی نوفل کے عبید اللہ بن عدی غزوہ روم کی طرف گئے۔ کہتے ہیں کہ جب ہم شام میں حمص کے علاقے سے گزرے تو خیال آیا کہ کیوں نہ حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی بن حرب سے ملتے چلیں، وہ یہیں کہیں رہتا ہے اور اس سے شہادتِ حمزہؓ کا قصہ براہ راست معلوم کریں گے۔<sup>②</sup> ہم پوچھتے پوچھتے آگے بڑھے تو ہمیں ایک آدمی نے بتایا کہ وہ اپنے محل کے سائے میں بیٹھا ہے اور دیکھنے سے ایسے لگتا ہے جیسے کہ پانی کی کوئی سیاہ مشک ہو۔<sup>③</sup> ہم جلدی ہی اس کے پاس جا پہنچے، ہم نے سلام کہا اور اس نے سلام کا جواب دیا۔

عبید اللہ نے کہا: وحشی! کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟

عبید اللہ نے جب ان سے یہ سوال کیا تو اس وقت انہوں نے ڈھالے سے اپنا سر اور منہ لپیٹا ہوا تھا اور وحشی ان کی صرف آنکھیں یا پاؤں ہی دیکھ سکتا تھا۔ وحشی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا: نہیں، البتہ اتنا یاد پڑتا ہے کہ مکہ میں عدی بن خیار نے ابوالحیص کی بیٹی اُم قتال نامی

① کتاب اللباس: باب التصاویر، باب عذاب المصوّرین، باب نقض الصور، باب ماوطع من التصاویر، باب من کره القعود علی الصور، باب کراهیة الصلاة فی التصاویر، باب لا تدخل الملائکة بیتاً فیہ صورة، باب من لم یدخل بیتاً فیہ صورة، باب من لعن المصوّر، باب من صور صورة..... احادیث نمبر ۵۹۴۹ تا ۵۹۶۳

② حدیث ۴۷۲..... نیز البدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۱۷

③ محدثین اور اہل علم کو شش کرتے تھے کہ جو بات انہیں کسی واسطہ سے معلوم ہوئی ہو وہ حتی الامکان اس اصل آدمی سے سنی اور معلوم کی جائے جو صاحب واقعہ ہو۔

④ البدایہ والنہایہ میں ہے: 'گدھ' کے مشابہ بیان کیا گیا ہے۔

ایک عورت سے شادی کی تھی۔ اس عورت نے ایک بچے کو جنم دیا تو مجھے کوئی دایہ ڈھونڈھنے کا کہا گیا۔ چنانچہ جب دایہ آئی تو میں نے اس کا بچہ اٹھا کر اس دایہ کے حوالے کیا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ تیرے یہ پاؤں اسی جیسے ہیں۔ گویا اس نے مجھے بخوبی پہچان لیا اور ٹھیک پہچانا۔<sup>⑤</sup> پھر عبید اللہ نے اپنے سر اور منہ سے اپنی پگڑی ہٹالی اور پوچھا کہ کیا تم ہمیں حمزہ کے قتل کی تفصیل بیان کر سکتے ہو؟..... اس نے کہا: کیوں نہیں؟

اس نے تفصیل بتائی کہ مکہ کے طیمہ بن عدی کو جناب حمزہ نے بدر میں قتل کیا تھا۔ میرے مالک جبیر بن مطعم نے مجھ سے کہا: اگر تو میرے چچا کے بدلے حمزہ کو قتل کر دے تو تو آزاد ہوگا۔ چنانچہ عینین یعنی اُحد کے سال جب قریشی جنگ کے لیے نکلے تو میں بھی ان کے ساتھ نکل کھڑا ہوا۔ میدان میں جب صفیں آمنے سامنے ہوئیں تو قریش کی طرف سے سباع بن عبدالعزیٰ خزاعی نے مسلمانوں کو مقابلے کے لیے لاکارا تو حمزہ بن عبدالمطلب اس کے مقابلے میں نکلے، اور بولے: ارے سباع! اوئے ابن اُمّ انمار کے بیٹے، جو عورتوں کی فرجیں کاٹتی ہے<sup>⑥</sup> تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کرتا ہے۔ چنانچہ حمزہ نے ایسا وار کیا کہ وہ گذشتہ کل (یعنی قتل) ہو گیا اور میں حمزہ کی گھات میں ایک چٹان کے نیچے چھپا ہوا تھا۔

جب حمزہ میرے قریب آئے تو میں نے اس کی ناف کے نیچے کا نشانہ لے کر اپنا بھالا دے مارا جو ان کی رانوں کے درمیان سے آر پار ہو گیا، اور یہ ان کی زندگی کے آخری لمحات تھے۔ اور پھر میں لشکر گاہ میں اطمینان سے جا بیٹھا، کیونکہ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا اور مجھے آزادی مل گئی۔ پھر قریشی مکہ واپس ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ آ گیا۔ پھر میں مکہ ہی میں رہنے لگا حتیٰ کہ فتح مکہ کے موقع پر یہاں اسلام کی اشاعت ہو گئی تو میں طائف چلا گیا۔

بہت حیران پریشان تھا، سوچتا تھا کہ شام یا یمن وغیرہ کی طرف نکل جاؤں۔ میں اسی سوچ بچار میں تھا کہ ایک آدمی نے مجھے کہا: تجھے افسوس! وہ (محمد ﷺ) اللہ کی قسم! جو کوئی اس کے دین میں داخل ہو جائے اور حق کی شہادت کا اقرار کر لے تو وہ اسے کسی طرح قتل نہیں کرتے۔ چنانچہ اہل طائف نے اپنا وفد رسول اللہ ﷺ کی طرف بھیجا اور مجھے بتلایا گیا کہ محمدؐ قاصدوں کے درپے آزار نہیں ہوتے۔ تو میں بھی ان کے ساتھ چلا آیا اور آپ ﷺ کے

⑤ اور یہ بچہ اس نے تقریباً پچاس سال پہلے دیکھا تھا۔ (فتح الباری)

⑥ یعنی وہ لڑکیوں کے ختنے کرتی ہے اور یہ عمل عرب میں ہوتا ہے اور اسلام نے بھی اسے باقی رکھا ہے۔

سامنے آن کھڑا ہوا۔ جب آپؐ نے مجھے دیکھا تو بولے: وحشی ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ پوچھا: کیا تو نے حمزہؓ کو قتل کیا تھا؟ میں نے عرض کیا: بات ایسے ہی ہے جیسے آپ کو پہنچی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تو اپنا چہرہ مجھ سے چھپا نہیں سکتا؟

پھر میں وہاں سے نکل آیا اور جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی اور مسلمانہ کذاب نے خروج کیا تو میں نے اپنے دل میں کہا: کیوں نہ ہو کہ میں اس کی طرف نکلوں، اور ہو سکے تو اسے قتل کر دوں شاید اس طرح میرے سنگین جرم قتل حمزہؓ کی کوئی تلافی ہو جائے۔

چنانچہ میں نے دیکھا کہ ایک آدمی ایک ٹوٹی ہوئی دیوار میں کھڑا ہے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی سیاہی مائل اونٹ ہو، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، تو میں نے اس کی چھاتی کا نشانہ لے کر اپنا بھالا مارا جو اس کے کندھوں کے آر پار ہو گیا اور پھر قریب سے ایک انصاری اچھلا اور اس نے تلوار سے اس کی کھوپڑی تن سے جدا کر دی (اور یہ ابودجانہؓ تھے) پھر ساتھ کے گھر پر سے ایک لونڈی نے پکار لگائی۔ ہائے افسوس امیر المؤمنین! ایک کالے غلام نے اسے قتل کر ڈالا۔ وحشی نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کے بعد اللہ کے ایک بہترین بندے کو قتل کیا تھا تو پھر سب سے بدترین آدمی کا کام بھی میں نے ہی تمام کیا۔

ہمارا استدلال اس واقعہ سے ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام اور ناجائز ٹھہرایا ہے، اس کا بدل بلکہ نعم البدل حلال اور پاکیزہ صورت میں یقیناً مہیا فرمایا ہے۔ اب لوگوں کا انتخاب ہے کہ وہ حلال کی طرف راغب ہوتے ہیں یا حرام کی طرف۔

صحابہ میں سیدنا عمر بن خطابؓ کے متعلق آتا ہے، بہت بڑے صاحب فراست اور صاحب قیافہ تھے اور یہودیوں میں مجزز مدلیٰ کا واقعہ تو مشہور و معروف ہے کہ اس نے سیدنا زیدؓ اور اسامہؓ کے پاؤں دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ إن هذا الأقدام بعضها من بعض۔ یہ قدم ایک دوسرے میں سے ہیں حالانکہ حضرت زیدؓ گورے رنگ کے اور جناب اسامہؓ کی رنگت سیاہ تھی۔ یاد رہے کہ تصویر سے بھی زیادہ آج کے دور میں جس شے پر کسی فرد کی شناخت میں اعتبار کیا جاتا ہے وہ فنگر پرنٹس (انگلیوں کے نشانات) ہیں اور لازمی و ضروری کاغذات میں انہی کی بنا پر شہادت ثبت کی جاتی ہے، بلکہ شناختی علامات میں سے سب سے بڑھ کر قابل اعتماد یہی علامت ہے۔ اگر اس علم اور فن کا احیا کیا جائے تو مسلمان مرد اور خواتین تصویر کی قباحت سے یقیناً بچ سکتے ہیں۔ وصلی اللہ علی النبی محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین



## اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین؛ ایک تعارف

کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود کا تعارف، عقائد و نظریات، فکر اور فلسفہ

گزشتہ چند روز سے قومی میڈیا میں اسلامی نظریاتی کونسل کی تازہ سفارشات زیر بحث ہیں۔ اس سے پہلے بھی کونسل کے چیئرمین جناب خالد مسعود صاحب کے بعض بیانات پر بڑی لے دے ہوتی رہی ہے، ان سفارشات اور بیانات پر تبصرہ اور تنقید بھی لگا تا ر شائع ہو رہی ہے اس لئے ضروری تھا کہ ان کی فکری شخصیت کی ایک جھلک دکھا دی جائے کیونکہ عوام پاکستان کی طرح عموماً لکھے پڑھے حضرات بھی جناب چیئرمین کی شخصیت، ان کے علم و فضل، فہم و فراست اور عقائد و نظریات سے نا آشنا ہیں۔ بلاشبہ اگر وہ ان کی قد آور شخصیت ان کی مادر علمی، تربیت گاہ اور ان کے اساتذہ سے آگاہ ہوتے تو انہیں کونسل کی پیش کردہ سفارشات کا پس منظر سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوتی۔

ہمارے خیال میں کسی شخصیت کی شرافت و دیانت اور عقائد و نظریات کو پرکھنے کا بہترین ذریعہ اس کا خاندانی پس منظر اور اس کے اساتذہ علم و فن اور ان کی مادر علمی یعنی درس گاہ کا تعارف ہے۔ چنانچہ اگر کسی شخص کے اساتذہ ملحد و بے دین ہوں یا اس کی تربیت گاہ میں الحاد و زندہ کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہو، تو ان اساتذہ اور تربیت گاہ سے اخذ و استفادہ کرنے والے کسی 'محقق' سے مسلمانوں کو خیر کی توقع رکھنا یا ان کی خلاف اسلام سرگرمیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا اور چیخنا چلانا نہ صرف عبث ہے بلکہ لائقِ صد ماتم۔ اسی مقصد سے جناب ڈاکٹر خالد مسعود کے عقائد و نظریات اور ان کی فکری پرواز اور ان کے اساتذہ علم و ہنر کا کچھ تعارف پیش خدمت ہے۔

پیش نظر تعارف اور عقائد و نظریات ڈاکٹر خالد مسعود کے اس انٹرویو سے ماخوذ ہیں جو انہوں نے روزنامہ 'جنگ' کراچی کے ایک نمائندہ کو دیا اور سنڈے میگزین ۲۸ اکتوبر ۲۰۰۷ء

میں شائع ہوا۔ جناب خالد مسعود اپنے والد کے بڑے بیٹے ہیں، ان کے دوسرے بھائی محمود شام ان سے چھوٹے ہیں، ان کا آبائی تعلق انبالہ سے ہے۔ آپ کے والد ماجد جناب صوفی شیر محمد صاحب مرحوم ایک نیک دل انسان اور پرانے آحراری تھے۔ قیام پاکستان کے بعد پہلے لاہور اور پھر جھنگ میں انہوں نے سکونت اختیار کی۔ متحدہ ہندوستان میں انہوں نے انگریز دشمنی کی پاداش میں جیلیں کاٹیں۔ پاکستان بن جانے کے بعد بھی، ہماری معلومات کے مطابق، وہ جمعیت علمائے اسلام اور تبلیغی جماعت سے بھی وابستہ رہے اور رزقِ حلال کی خاطر انہوں نے جھنگ میں 'ارسطو دواخانہ' کے نام سے ایک مطب قائم کیا اور زندگی بھر اسی سے وابستہ رہے۔

جس طرح موصوف صوفی شیر محمد مرحوم انگریز دشمن تھے اور استعمار کو مسلمانوں کا سب سے بڑا حریف اور دشمن سمجھتے تھے، اسی طرح انہوں نے اپنی اولاد کی بھی یقیناً انہی خطوط پر تربیت کرنا چاہی ہوگی۔ مگر چونکہ انگریز کی عیاری اور مکاری مشہور ہے اور جس طرح شیطان اللہ کے نیک بندوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو ان کی اولادوں سے بدلے لیتا ہے، اسی طرح شیطان کی معنوی اولاد انگریز کی بھی یہی روش رہی ہے کہ جن کے سامنے ان کا بس نہیں چلتا، وہ اپنا بدلہ ان کی اولادوں سے لیتا ہے۔ افسوس کہ یہی کچھ موصوف صوفی شیر محمد مرحوم کی اولاد کے ساتھ بھی ہوا۔ چنانچہ ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کو ان کے والد ماجد نے ابتدائی طور پر اسکول پڑھایا، ازاں بعد وہ ان کو دارالعلوم دیوبند بھیجنا چاہتے تھے، مگر افسوس کہ اب بیٹا باپ کی فکر و سوچ کی مخالف سمت جا چکا تھا۔ چنانچہ خالد مسعود صاحب نے جھنگ کے ایم بی ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ پرائیویٹ طور پر منشی فاضل کیا، گھریلو معاشی حالات مزید تعلیم جاری رکھنے کے متحمل نہ تھے تو اسلامیہ ہائی اسکول میں ٹیچرز کی نوکری مل گئی، اسی دوران ایف اے اور بی اے کیا، امتحان میں اچھے نمبر آ گئے تو اسکا لرشپ مل گیا۔

مزید تعلیم کے لئے لاہور کا رخ کیا، ایف سی کالج لاہور، گورنمنٹ کالج لاہور اور اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی ادب میں داخلہ کا امتحان دیا مگر افسوس! کہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، مجبوراً اسلامیہ کالج لاہور سے ایم اے اسلامیات کیا۔ اسی دوران مشہور ملحد اور صدر ایوب کے نفس ناطقہ ڈاکٹر فضل الرحمن نے، جو بعد میں عیسائی ہو کر مرزا، اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کراچی

میں داخلہ کی پیشکش کی اور داخلہ کا خط بھیجا۔ حسن اتفاق کہنے یا سوئے اتفاق! کہ ڈاکٹر فضل الرحمن کے فلسفہ الحاد و استشراق نے اپنا کام دکھایا اور موصوف کے دل و دماغ کو ’فرسودہ مذہبی‘ تصورات سے پاک کر دیا گیا۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اس فکر و فلسفہ میں مزید رسوخ پیدا کرنے کے لئے آپ کو کینیڈا میں مانٹریال میکگل یونیورسٹی بھیج دیا گیا، وہاں سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد واپس تشریف لائے تو اُن کے استاذ ڈاکٹر فضل الرحمن کی جگہ خالی ہو چکی تھی اور ضرورت تھی کہ ان کی مسند پر ان کی فکر و سوچ کا انسان براجمان ہو۔ چنانچہ ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کو اپنے استاذ موصوف کی خدمات کے تسلسل کو جاری رکھنے کی خدمت پر مامور کر دیا گیا۔ ڈاکٹر فضل الرحمن کی صحبت، تربیت اور کینیڈا کی مانٹریال یونیورسٹی کے مستشرق اساتذہ کی محنت برآئی تو اب ڈاکٹر خالد مسعود وہ نہیں تھا جس نے جھنگ کے ایک دین دار گھرانے میں نشوونما پائی تھی اور جس کے قلب و جگر اور دل و دماغ میں انگریز اور استعمار کی نفرت کا بیج بویا گیا تھا۔ اب اس کے دل میں انگریز اور استعمار کے خلاف نفرت کے بجائے محبت و اُلفت کے جذبات تھے، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:

”بہت ساری چیزوں کے بارے میں اب میری رائے بدل گئی ہے۔ لیکن آزادی کا تصور، آزادی کے لئے محنت اور خاص طور پر استعمار کے ساتھ نفرت اور استعمار کے ساتھ جو ایک تعلق ہے، وہ جب تک میں باہر نہیں گیا، اس وقت تک استعمار سے نفرت کا تعلق رہا، لیکن جب خود جا کر استعماری معاشرے کو دیکھا تو پتا چلا کہ کسی حد تک ہمارا اپنا تصور محدود تھا اور ہم پوری طرح مغربی معاشرے کو سمجھ نہیں پائے۔“ (سنڈے میگزین، کراچی، ۲۸ اکتوبر ۲۰۰۷ء)

موصوف کی جب برین واشنگ ہو گئی اور وہ مسلم معاشرہ کے بجائے استعمار اور استعماری معاشرہ کو حق و صواب سمجھنے لگے تو ان کے لئے اندرون و بیرون ملک ہر طرح کی ترقیات اور مناصب کے دروازے کھل گئے، چنانچہ وہ اس دوران نائیجیریا گئے، ایک سال تک یونیورسٹی آف پنسلوانیا میں رہے، اور ۱۹۷۹ء میں اسکا لرشپ پر امریکا چلے گئے اور وہاں کئی ایک یونیورسٹیوں میں لیکچر دیئے، اسی طرح دوبارہ لیکچرار کے طور پر پیرس بھی گئے، مگر اس پورے عرصہ میں ’اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ‘ اسلام آباد میں ملازمت کرتے رہے اور ۱۹۹۹ء میں اس



اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کا تعارف

عہدہ سے ریٹائر ہو گئے۔ اس عرصہ میں موصوف مکمل طور پر مغرب کے رنگ میں رنگ گئے، اور اس میں سب سے اہم کردار امریکا کی 'کمپنی ان سٹڈی آف مسلم سوسائٹی' کی ممبر شپ نے ادا کیا، چنانچہ موصوف خود فرماتے ہیں کہ

”اس سلسلہ میں دو چیزیں میرے کیریئر میں بہت اہم ہیں، امریکا میں سوشل سائنس کی ایک ریسرچ کونسل ہے، ان کے مختلف گروپ، مختلف کمیٹیاں، مختلف فیلڈ سے ہوتی ہیں، انہوں نے ایک نئی کمیٹی بنائی تھی، کمیٹی ان سٹڈی آف مسلم سوسائٹی۔ عام طور پر امریکا میں جس سٹڈی کا رجحان ہے وہ Area سٹڈیز ہیں اور اسلام ان میں سے ملل ایسٹ وغیرہ میں اہم پارٹ ہوتا ہے۔ یہ پہلی کمیٹی تھی جس کا فوکس مسلم سوسائٹی تھا۔ اس کمیٹی کی مجھے ممبر شپ کی آفر دی گئی، یہ ممبر شپ پانچ سال کی تھی۔ اس ممبر شپ کی وجہ سے ہر سال دو دفعہ امریکا جانا ہوتا تھا، اس کے علاوہ مختلف اسلامی ممالک میں جانا ہوتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری دانشورانہ ڈیولپمنٹ اس فیلڈ میں زیادہ ہے کیونکہ یہ سب عالم فاضل لوگ تھے۔

پہلا دھچکا مجھے اسی وقت لگا تھا جب میں میکگل پہنچا تھا، وہاں جا کر ساری مسلم تاریخ اکائی کے ساتھ، نہ کہ ٹکڑوں میں تقسیم کر کے پڑھی۔ اسلامی تاریخ کے فوجی، معاشی، اسلامی پہلو تمام پڑھے تو وہ جو دھچکا تھا کہ ہم کس طرح اسلامی تاریخ کو سمجھتے ہیں۔“ (ایضاً)

گویا امریکا اور ان کی اس کمیٹی کی ممبر شپ کی برکت سے موصوف کی آنکھیں کھل گئیں اور اب تک امت مسلمہ کے بارہ میں وہ جس خوش فہمی میں مبتلا تھے، وہ امریکی استعمار کی مرتب کردہ امت مسلمہ کی تاریخ، فوجی، معاشی اور اسلامی تصورات کی غلطی ان پر روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی اور وہ اپنے استاذ اور مربی ڈاکٹر فضل الرحمن کے نظریہ الحاد اور ان کی اس سلسلہ کی الحادی خدمات کے معترف ہو گئے اور سمجھنے لگے کہ ڈاکٹر فضل الرحمن کا وجود جس طرح ان کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھا، ایسے ہی پاکستان میں جاری الحادی تحریک کے لئے بھی از حد ضروری تھا، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:

”ڈاکٹر فضل الرحمن کے باہر جانے سے پاکستان کو نقصان ہوا، انہیں ۱۹۶۹ء میں پاکستان سے نکال دیا گیا، پہلے وہ برطانیہ گئے، پھر شکاگو یونیورسٹی میں۔“ (ایضاً)

ڈاکٹر فضل الرحمن سے ان کے جوڑ بیٹھنے کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ جس طرح وہ ایک

خالص دینی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور استعمار کی چمک دمک سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنے دین و مذہب، معاشی، معاشرتی اور اسلامی تاریخ سے بغاوت کی تھی، ٹھیک اسی طرح خالد مسعود صاحب بھی وہی پس منظر رکھتے تھے اور بعینہ اسی طرح وہ بھی امریکا، کینیڈا اور برطانیہ کی برکت سے دین و مذہب سے باغی ہو گئے، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:

”اصل میں ان (یعنی ڈاکٹر فضل الرحمن) کا تعلق ہزارہ سے تھا، ان کے والد مولانا شہاب الدین دیوبندی تھے اور وہ مولانا محمود الحسن اور بڑے جید علما کے ساتھیوں میں سے تھے۔ مولانا شہاب الدین اہل حدیث مکتبہ فکر کے امام ابن تیمیہ کے بہت قائل تھے، اہل حدیث ان کو بہت مانتے ہیں۔ ڈاکٹر فضل الرحمن کی مذہبی تعلیم مدرسے سے نہیں، بلکہ ان کے والد صاحب سے تھی جو لاہور میں اس وقت درس دیتے تھے۔ ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، ان کی علیت میں کوئی شک نہیں ہے، جب وہ آکسفورڈ گئے تھے تو سنا ہے کہ شیروانی اور داڑھی کے ساتھ ہاتھ میں مولویوں والی چھڑی لے کر گئے تھے، لیکن وہاں جا کر کلین شیو ہو گئے تھے۔“ (سنڈے میگزین کراچی: ۲۸ اکتوبر)

گویا جس طرح وہ ایک عالم دین کے بیٹے، دین دار، ظاہری شباہت، داڑھی، ٹوپی، شیروانی اور چھڑی وغیرہ کے ساتھ آکسفورڈ گئے اور ان کے فلسفہ استشراق سے متاثر ہو کر کلین شیو ہو گئے، موصوف خالد مسعود صاحب نے بھی ان کی تقلید کی۔ مگر اے کاش کہ ڈاکٹر فضل الرحمن کو پاکستان سے نکال دیا گیا اور موصوف اکیلے اور بے یار و مددگار ان کی فکر و فلسفہ کے وارث رہ گئے اور تحریک الحاد و استشراق کی بھاری بھر کم ذمہ داری ان کے ناتواں کندھوں پر آگئی۔ ظاہر ہے ان کو اس کا جس قدر قلق و افسوس ہوا ہوگا وہ خود ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں، چنانچہ مندرجہ بالا اقتباس میں انہوں نے اسی درد و کرب کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر خالد مسعود نے جس طرح اپنی دینی، مذہبی، اور فکری تبدیلی اور اس میں انقلاب کا ذکر کیا ہے اور جس طرح انہوں نے ڈاکٹر فضل الرحمن کے علم و فضل کی تعریف و توصیف کی ہے، اس کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ان کے عقائد و نظریات سے بحث کی جائے۔ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چند ایک اچھوتے عقائد و نظریات اور دین و مذہب، مسلم تاریخ اور مسلم تحریکوں کے بارے میں باغیانہ جذبات کا بھی تذکرہ کر دیا جائے:



① موصوف ڈاکٹر فضل الرحمن کے عائلی قوانین کے بہت بڑے مداح، حامی اور داعی ہیں اور نعوذ باللہ وہ انہیں قرآن مجید کے عائلی قوانین کا تسلسل سمجھتے ہیں، چنانچہ خود فرماتے ہیں: ”عائلی قوانین کا تعلق معاشرے سے ہے اور جو قرآن کریم اور سنت میں بھی عائلی قوانین ہیں اور وہ اس وقت کی معاشرتی ضرورتوں کو مد نظر رکھ کر جہاں جہاں ضرورت تھی۔ بنیادی طور پر قبل اسلام بھی وہ چیزیں موجود تھیں: نکاح، طلاق، وراثت یہ سب چیزیں قبل از اسلام موجود تھیں، اس میں جہاں جہاں زیادتی تھی، خاص طور پر عورتوں کے ساتھ، اس میں قرآن کریم میں اور رسول اللہ ﷺ کی سنت میں ان کی اصلاح کر دی گئی۔“ ایضاً

کیا موصوف سے کوئی پوچھ سکتا ہے کہ ان کے بقول جب قرآن و سنت کے ذریعے عائلی قوانین میں قابل اصلاح امور کی اصلاح کر دی گئی تھی تو اب ڈاکٹر فضل الرحمن اور ان کے جانشین خالد مسعود صاحب کو اس میں مزید تبدیلیوں کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟ کیا نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے اصلاح طلب امور کی اصلاح میں کوئی کمی رہ گئی تھی؟ جس کے لئے چشم بد دور ان کو میدان میں کودنا پڑا؟ اگر نہیں تو کیا یہ قرآن و سنت سے بغاوت اور ان کی توہین و تنقیص کے مترادف نہیں؟

② ان کے ہاں چار شادیوں پر قدغن ہونی چاہئے کیونکہ یہ حکم الہی ”اگر عدل نہ کر سکو۔“ کے خلاف ہے۔ چنانچہ وہ ارشاد الہی: ”پس نکاح کرو دو دو، تین تین اور چار چار اور اگر عدل نہ کر سکو تو ایک ہی نکاح کرو۔“ کی صریح نص اور عدل کر سکو کے معنی و مفہوم میں تحریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”قرآن مجید میں چار تک شادیاں کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کی تعداد کو محدود کرنا اور پھر اس طرح مزید محدود یہ کہہ کر قرآن مجید میں کر دیا گیا کہ عدل کرو۔ میرے خیال میں سب سے پہلے عدل شرط ہے، عدل یہ نہیں کہ آپ بیویوں کو نان نفقہ دے دیں۔“ ایضاً

موصوف قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت ”اور عدل نہ کر سکو۔“ کا جو مفہوم بیان فرما رہے ہیں، اگر ان کو ناگوار خاطر نہ ہو تو کیا ہم ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ یہ معنی کس آیت، حدیث میں آیا ہے؟ یا، صحابہ کرام، ائمہ ہدیٰ، ائمہ تفسیر اور محقق علما میں سے کس نے بیان کیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو کیا یہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام، ائمہ اسلاف کی تحقیق سے

بغاوت اور ان کو جاہل و لاعلم کہنے کے مترادف نہیں؟ اگر بالفرض اس کا یہی معنی و مفہوم تھا تو کیا اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ ﷺ صاف طور پر یہ نہیں فرما سکتے تھے کہ ایک سے زیادہ نکاح نہ کیا کرو؟ بتلایا جائے کہ اس مختصر سی تعبیر کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ نے اتنی طویل تعبیر کیوں اختیار کی؟ اس کے علاوہ موصوف نے تعدد و ازدواج کی ضرورت کو ایک معاشرتی ضرورت کہتے ہوئے اس کے لئے جو مثال دی ہے، ہمارے خیال میں کوئی مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا، بلکہ صحیح معنی میں ایک باغیرت مسلمان کو اس کے تصور سے بھی قے آئے گی، مگر موصوف چونکہ انگریزی معاشرت کے دل دادہ ہیں، اس لئے انہوں نے بلا تکلف وہ سب کچھ کہہ دیا، جس کی کسی باغیرت انسان سے توقع نہیں کی جاسکتی، چنانچہ پڑھئے اور سردھنئے:

”میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ اگر معاشرتی اور معاشی طور پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا لازمی طور پر ہے تو ٹھیک ہے، آپ اس کو اجازت دے دیجئے! صرف معاشرے پر آپ بات نہیں کر رہے، اگر لوگ یہ ضرورت سمجھیں کہ ایک عورت دو مردوں سے تین مردوں سے چار مردوں سے تعلقات رکھے تو آپ اس کو اس بات کی اجازت نہیں دیں گے، کیوں؟ کیونکہ آپ معاشرے کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کر رہے ہیں، آپ فیصلہ دیتے ہیں رواج، اقدار اور اسلامی روایات کے اوپر، تو اسلامی روایات پر اگر آپ کبہ و مابز کر رہے ہیں کہ آپ عدل کے بغیر بھی اجازت دے رہے ہیں تو پھر اس کا مطلب ہے واضح طور پر قرآن و سنت کی رہنمائی میں نہیں، بلکہ جو اپنی معاشرتی اقدار ہیں، ان کی راہ نمائی میں کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ معاشرتی اقدار اور قرآن و سنت دونوں کو ساتھ لے کر چلنا ضروری ہے۔“ ایضاً

کیا ہم ڈاکٹر صاحب سے یہ پوچھنے کی گستاخی کر سکتے ہیں کہ ایک مرد کو چار شادیوں کی اجازت معاشرہ نے دی ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو ایک قرآنی حکم کے مقابلہ میں نہایت بے حیائی، بے شرمی اور بے غیرتی پر مشتمل ایک لچر، واہیات اور خود ساختہ مغربی معاشرتی ضرورت پیش کر کے ایک حکم الہی کی تضحیک کرنا کسی مسلمان کو زیب دیتا ہے؟ کیا کوئی مسلمان اس کا تصور کر سکتا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو کیا کہا جائے کہ موصوف دانش گاہ و فرنگ سے اس قدر مرعوب ہیں کہ ان کی ہم نوائی میں وہ قرآن و سنت کے صریح احکام کی مخالفت سے بھی نہیں ہچکچاتے۔

۳) ڈاکٹر فضل الرحمن کے مرتب کردہ اور صدر ایوب خان کے نافذ کردہ عائلی قوانین میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرا نکاح کرنا چاہے تو پہلے اپنی بیوی سے اجازت لے، اگر وہ اجازت دے دے تو فہما، ورنہ اگر اس نے بلا اجازت دوسرا نکاح کیا تو اسے عائلی قوانین کی رو سے جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔

ظاہر ہے کہ یہ حکم قرآن و سنت کی صریح نصوص صحابہ کرام، ائمہ مجتہدین اور چودہ صدیوں کے علمائے کرام کی تحقیقات کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ لیکن موصوف ڈاکٹر خالد مسعود اس کے جواز میں نعوذ باللہ قرآن کریم پر اپنی تحریف کا تیشہ چلاتے ہوئے کہتے ہیں:

”قرآن کریم میں بڑا واضح ہے کہ جہاں بھی حکم ہے، اگر تم یہ سمجھو تو دو، تین، چار شادیاں کرو، لیکن یہ یقین کر لو کہ تم عدل کرو گے۔ تو عائلی قوانین بنانے والوں نے سوچا کہ عدل کی ایک صورت یہ تھی کہ جو آپ کی پہلی بیوی ہے، اگر وہ اجازت دے دے تو ٹھیک ہے، تو یہ اجازت اس عدل کو کہا گیا، جس کا قرآن مجید میں تقاضا ہے۔“

موصوف ڈاکٹر صاحب سے کوئی پوچھے کہ اس آیت کا جو مفہوم عائلی قوانین کے مرتبین نے اخذ کیا ہے، کیا ان کے علاوہ کسی اور سے بھی منقول ہے؟ کیا یہ بزرگ مہر حضور ﷺ، صحابہ کرام اور ائمہ مجتہدین سے بھی زیادہ عقل و فہم رکھتے ہیں؟ کیونکہ انہوں نے تو دوسری شادی کو اس عدل سے کہیں نہیں جوڑا، پھر اس کے علاوہ ان کو اس بات پر بھی سوچنا چاہئے کہ چلئے ایک شخص نے اس عدل اجازت کا تقاضا پورا کرتے ہوئے پہلی بیوی سے اجازت لے لی اور دوسرا نکاح کر لیا، لیکن بایں ہمہ اگر وہ عادل انسان پھر بھی پہلی بیوی کو نان نفقہ نہیں دیتا، اس کو اس کی باری سے محروم کرتا ہے یا اس پر ظلم و ستم کرتا ہے یا اس سے بے اعتنائی برتا ہے تو پھر عائلی قوانین اس مظلومہ کی کیا مدد کریں گے؟

اور وہ اس عادل کے خلاف کچھ کبھی کیوں سکیں گے، کیونکہ وہ تو عدل کے قانونی تقاضے پورے کر چکا ہے، بتلایا جائے کہ اس پر عدل کی خلاف ورزی کا جرم کیونکر لاگو ہوگا؟ اس سے معلوم ہوا کہ عائلی قوانین عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہیں کرتے، بلکہ عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی مسلمان مرد کو اس کے شرعی اور اسلامی حق سے نہ روکا جائے، ہاں البتہ اس کی اس طرح ذہن سازی کی جائے کہ اگر اس نے ایک سے زیادہ نکاح کئے اور اپنی بیویوں



کے برابر حقوق ادا نہ کئے تو قیامت کے دن اس کا گریبان ہوگا اور اس کی مظلوم بیویوں کا ہاتھ ہوگا، صرف یہی نہیں بلکہ قیامت کے دن ایسا شخص مفلوج کر کے اٹھایا جائے گا۔

بتلایا جائے کہ ایک مسلمان یہ وعید سننے پر عدل و انصاف کرے گا یا محض بیوی کی اجازت دینے پر.....؟

۴) خالد مسعود صاحب حالیہ بینکنگ کے یہودی سودی نظام کے بھی حامی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ قرآن کریم نے جس سود کی ممانعت کی ہے وہ یہودیوں کا سسٹم تھا، اب وہ نہیں ہے تو یہ موجودہ بینکنگ کا سود بالکل جائز ہے، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:

”میری ذاتی رائے یہ ہے کہ حالیہ دور میں بینکنگ کا نظام ہے جو خالد اسحق صاحب کی رائے تھی، اس میں کسی قسم کا ظلم نہیں ہے اور بینکرز جو ہیں اور بینکنگ سسٹم ہے، اس میں پرانے زمانے والا یہودیوں کا گروہ نہیں ہے، بلکہ ایک سسٹم ہے جس میں یہ لوگ بیٹھ کر حساب لگاتے ہیں کہ اس سود کی شرح کیا ہوگی اور اس میں کتنا اضافہ کرنا چاہئے اور کیا کرنا ہے؟ اس میں یہ لوگ اپنے معاملات بھی دیکھتے ہیں اور سٹیٹ کے معاملات بھی دیکھتے ہیں۔ کیونکہ اس میں استحصال نہیں ہے، اس لئے یہ جائز ہے اور جو حضور ﷺ کے زمانے میں جب یہودی زیادہ کاروبار کرتے تھے، اس میں یہ تھا کہ وہ جب قرض دیتے تھے اور اس کے بعد جب وہ واپس آتا تھا، سال کی بات ہوتی تھی یا چھ ماہ کی، تو اس سے کہا جاتا تھا کہ تم اس وقت پورا قرض ادا کرتے ہو، یا اس میں اضافہ کر دو؟ تو وہ کہتا تھا کہ ٹھیک ہے، ۱۰۰ کے بدلے ایک سو پچاس میں تمہیں دوں گا، لیکن ابھی نہیں دے سکتا، تو اسی طرح وہ دو گنا اور تین گنا کرتے رہتے تھے، وہ نظام اب رائج نہیں ہے۔“ ایضاً

جناب خالد مسعود اگر کسی احمقوں کی جنت میں نہیں رہتے تو ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ کیا موجودہ سودی بینکاری میں سود کی شرح شروع سے ہی متعین نہیں ہوتی؟ اگر جواب اثبات میں ہے اور یقیناً اثبات میں ہے تو اس اعتبار سے موجودہ سودی نظام یہودیوں کے سودی سسٹم سے بھی بدرجہا بدتر قرار پاتا ہے، کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے بقول یہودی تو ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں سود میں اضافہ کرتے تھے، جبکہ موجودہ نظام میں شروع دن سے ہی سود لگادیا جاتا ہے، پھر اس کے علاوہ کیا موجودہ سودی سسٹم میں، سود پر سود نہیں لگایا جاتا؟ مثلاً اگر ایک آدمی

نے ایک لاکھ روپے بینک سے قرض لیا ہے اور اس کی سالانہ شرح سود دس فیصد ہے تو سال بعد اس کے ذمہ ایک لاکھ دس ہزار ہوگا اور آئندہ سال اس پر ڈبل کر کے سود نہیں لگایا جاتا؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو بتلایا جائے کہ یہودی سودی نظام اور موجودہ سودی بینکاری نظام میں کیا فرق ہے؟ اگر ان دونوں نظاموں میں کوئی فرق نہیں تو یہودی سودی نظام ناجائز اور موجودہ بینکاری سودی نظام کیونکر جائز ہوگا؟ کیا سود کے جواز اور عدم جواز میں سود خور کے دین و مذہب کو بھی کوئی دخل ہے؟ کہ اگر سود لینے والا یہودی ہو تو سود ناجائز اور اگر سود لینے والا مسلمان ہو تو جائز ہوگا؟ اگر ان کی یہ الٹنی منطق مان لی جائے تو بتلایا جائے کہ یہ اصول تمام جرائم اور گناہوں پر بھی لاگو ہوگا؟ یعنی اگر کوئی غیر مسلم یہودی یا عیسائی زنا، چوری، ڈکیتی کرے تو اس کا حکم دوسرا اور اگر وہی کام کوئی نام نہاد مسلمان کرے تو اس کا حکم جدا ہوگا؟

⑤ ڈاکٹر خالد مسعود صاحب جہاد کے بارہ میں بھی ظاہر ہے، وہی نظریہ رکھتے ہیں جو ان کے اساتذہ نے انہیں پڑھایا ہے، چنانچہ وہ مسلمانوں کی جانب سے انگریزوں کے خلاف کئے گئے کسی جہاد سے متفق نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو بھی پرائیویٹ جہاد کا نام دے کر اس پر اپنی ناراضی کا اظہار کرتے ہیں، اسی طرح تحریک شہیدین یعنی مجاہدین بالا کوٹ کی قربانیوں پر پانی پھیرتے ہوئے اسے بھی جہاد قرار نہیں دیتے، بلکہ شہدائے بالا کوٹ کی شہادت کو بھی خالص مغربی نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہوئے اسے سکھوں کے خلاف جنگ کے بجائے مسلمانوں کی باہمی آویزش یا غیرت کے نام پر قتل کا عنوان دیتے ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

”جو کچھ ۱۸۵۷ء میں ہوا، بالکل اسی طرح آج بھی ہو رہا ہے، اس وقت بھی جو جہاد ہے مالاکنڈ، وزیرستان وغیرہ میں ہوا تھا، اب بھی وہی حالات ہیں۔ ایک فقہی سوال ہے اور ایک ہے تاریخی سوال۔ فقہی سوال تو یہ ہے کہ اس وقت بھی جہاد نہیں تھا، کیونکہ کسی کافری نہیں تھا۔ سید احمد بریلوی کا جو جہاد ہے، وہ بھی جہاد نہیں تھا، وہ جہاد سکھوں کے خلاف نہیں تھا، پٹھانوں نے بھی ان کو مارا، پٹھان سکھوں سے نہیں ملے تھے، انہوں نے پٹھانوں کی عورتوں سے شادیاں کیں تو پٹھانوں کے لئے یہ مسئلہ بن گیا۔ اصل میں پرائیویٹ جہاد کی یہی خرابی ہوتی ہے۔“ (سنڈے میگزین، کراچی، ۲۸ اکتوبر)

ایسا لگتا ہے کہ موصوف اپنے آقاؤں کے خلاف کسی قسم کی کوئی بات سننا گوارہ نہیں فرماتے یہی وجہ ہے کہ انگریز بہادر کے مظالم کے خلاف جب بھی کسی نے آواز اٹھائی یا جس نے بھی کسی قسم کی کوئی تحریک پیا کی، وہ ان کے نزدیک بغاوت ہے اور بغاوت کی سزا قتل ہے۔ ظاہر ہے ڈاکٹر خالد مسعود صاحب پاکستان کے مسلم معاشرہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ انگریز کے خلاف جہاد حرام ہے، اس لئے انہوں نے اس کو پرائیویٹ جہاد کا نام دے کر اس کے خلاف اپنی دلی بھڑاس نکالی ہے۔

دراصل موصوف انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کی تحریک، مسلمانوں کے جہاد، جنگ آزادی اور سکھوں کے خلاف حضرت اقدس سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسماعیل شہید کے جہاد، ان کی جاں سپاری اور پوری جماعت کی شہادت و قربانی سے ناراض ہیں، اس لئے وہ اس کو پرائیویٹ جہاد کا نام دے کر ان مخلصین کو باغیوں کی صف میں لاکھڑا کرنا چاہتے ہیں اور ان کی شہادت کو بغاوت کی سزا کا نام دے کر ان کے قتل عام کو سند جواز فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر جہاد کے لئے وقت کی کافرانہ حکومت کی اجازت شرط ہے تو بتلایا جائے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے مقابلہ میں جہاد کے وقت کس سے اجازت لی تھی؟ اسی طرح آنحضرت ﷺ نے مشرکین مکہ بلکہ تمام کافر اقوام کے خلاف اپنے ۲۷ سے زیادہ غزوات میں کس کافر و مشرک حکومت سے اجازت لی تھی؟

اگر انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء کا جہاد اور سکھوں کے خلاف شہدائے بالا کوٹ کی تحریک پرائیویٹ جہاد تھا تو حضرات انبیاء کرام کا کافر اقوام اور حکومتوں کے خلاف جہاد کیونکر پرائیویٹ جہاد نہیں تھا؟ اگر جواب اثبات میں ہے اور یقیناً اثبات میں ہے تو بتلایا جائے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے جہاد پر کیا حکم لگایا جائے گا؟ چلئے اگر جہاد کے لئے حکومت وقت کی اجازت شرط ہے تو بتلایا جائے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہو یا تحریک شہیدین، اس میں مسلمان کس سے اجازت لیتے؟ کیا وہ انگریزوں اور سکھوں سے اجازت لیتے کہ حضور! ہم آپ کے خلاف جنگ اور جہاد کرنا چاہتے ہیں، کیا ہمیں اس کی اجازت ہے؟ تف ہے اس عقل و دانش پر اور حیف ہے اس فکر و سوچ پر۔

اس کے علاوہ ان کا یہ فرمان والا شان کہ شہدائے بالا کوٹ کی شہادت بھی سکھوں کے



مقابلہ میں نہیں ہوئی تھی بلکہ ان کو پٹھانوں نے قتل کیا تھا، اس لئے کہ تحریک شہیدین کے اکابر نے نعوذ باللہ پٹھانوں کی عورتوں سے نکاح کئے تھے اور پٹھانوں کو اس پر غیرت آئی اور انہوں نے ان کو قتل کر دیا تھا، کیا موصوف کا یہ فرمان ان اکابر کے خلاف کھلا بہتان نہیں؟ کیا موصوف اس بہتان کا کوئی حوالہ پیش کر سکتے ہیں؟ کیا آج تک کسی مسلمان مؤرخ نے بھی ایسا لکھا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو بتلایا جائے کہ موصوف کے طحطاہ اساتذہ اور مستشرق اکابر کے علاوہ کس مؤرخ نے یہ بات لکھی ہے؟ بلاشبہ یہ سب کچھ مغرب کے اس سبق کا نتیجہ اور اثر ہے جو موصوف نے کینیڈا، امریکا اور برطانیہ کی درس گاہوں میں بیٹھ کر پڑھا تھا اور اب خیر سے اس کو دہرا رہے ہیں۔ کیا ان کی یہ ہرزہ سرائی حضرات شہدائے بالا کوٹ کی قربانیوں پر پانی پھیرنے اور ان کی شخصیتوں کو داغ دار کرنے کے مترادف نہیں؟ کیا یہ دین دار پٹھانوں پر بھی بدترین تہمت نہیں؟ کہ ان کو ایک اسلامی لشکر کے قتل عام کا ذمہ دار ٹھہرایا جا رہا ہے؟ الغرض موصوف نام کے مسلمان ہیں، ورنہ ان کے دل و دماغ اور قلب و جگر میں اسلام، اسلامی قوانین، قرآن و سنت اور امت مسلمہ کے خلاف بغض و عداوت اور بغاوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ موصوف اسلامی نظریاتی کونسل میں بیٹھ کر کیا کیا کارنامے انجام دے رہے ہیں اور ان کی سازشوں کا دائرہ کس قدر پھیلتا جا رہا ہے اور ان کی علمی تحقیقی حیثیت کا کیا مقام ہے؟ اس کے لئے ایک واقعہ حال کا درد بھرا خط پڑھئے اور سردھنئے:

جناب مولانا سعید احمد السلام علیکم ورحمہ اللہ وبرکاتہ

روزنامہ 'اسلام' میں آپ کا مضمون 'کیا اسلام مکمل ضابطہ حیات نہیں؟' پڑھ کر دل خوش ہوا، اطمینان ہوا اور دل سے آپ کے لئے سے دعا نکلی، اللہ تعالیٰ آپ کو برکت اور استقامت دے۔ یہ مضمون پڑھ کر احساس ہوا کہ ابھی اللہ کے بندے موجود ہیں جو جاگ رہے ہیں، اللہ نے انہیں بصیرت بھی دی ہے اور قوت گویائی بھی۔ اکبر کے فیضی اور ابوالفضل کے بیانات، تاویلات اور سفارشات اتنی ضرر رساں نہ تھیں کہ انہیں آئینی تحفظ حاصل نہ تھا، تب علمائے حق موجود تھے جو اکبر کی موجودگی میں حق بات کہہ دیتے، اکبر خود بھی جانتا تھا کہ فیضی اور ابوالفضل خوشامدی ہیں۔ مگر آپ نے اپنے مضمون میں جس شخص کو آج کا فیضی یا ابوالفضل قرار دیا ہے، اس کے بیانات، تاویلات، سفارشات کو آئینی حیثیت حاصل ہے۔ عوام کو بھی یہ یقین ہے کہ

اس آئینی ادارہ سے جو بیان آئے گا، وہی اسلام کی درست اور مستند تعبیر ہے، پھر علمائے کرام کے اجماعی سکوت نے عوام کے اس یقین کو مزید تقویت بخشی، اگر یہ لوگ جاگ رہے ہوتے یا ان میں بصیرت ہوتی تو اس منصب پر اس شخص کی تقرری کے فوراً بعد ہی اسے بھگایا جاسکتا تھا۔ مگر ایسا نہ ہوسکا، چار سال کا عرصہ گزر گیا اور اس دوران اس نے بہت کچھ کر لیا، جو شاید آپ کے علم میں نہ ہو۔ مثال کے طور پر یہ کہ اس آئینی ادارہ میں ہر دس پندرہ دن کے بعد کوئی سیمینار فنکشن ہوتا ہے، آئین کی رو سے اس کی گنجائش نہیں اور بہت ہرزہ سرائی کی جاتی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ جب کونسل نے سفارش دی تھی کہ ضبط شدہ شراب بیچ کر اقلیتوں کی بہبود پر خرچ کی جائے تو ہمارے علمائے کرام پر سکوت مرگ طاری رہا، مگر جے سالک نے اس پر احتجاج کیا اور اس سفارش کی سخت مذمت کی۔ اسی طرح شیطان رشدی کو سر کا خطاب ملنے سے چند روز پہلے اس کونسل نے سفارش دی کہ موت کی سزا صرف قتلِ عمد پر ہے یا فساد فی الارض پر۔ کسی عالمِ دین نے اس پر گرفت نہیں کی، البتہ برطانیہ کے خلاف احتجاج کرتے رہے کہ اس نے رشدی کو سر کا خطاب کیوں دیا؟ اللہ کا شکر ہے کہ اس ادارہ کے سربراہ کے ایک خاص بیان کا آپ نے نوٹس لیا ہے، یہ بیان اخبارات میں آئے ہوئے کئی دن گزر چکے ہیں، کتنے ہی دینی مجلات شائع ہوتے ہیں مگر سب کی زبانوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔ اُم علی قلوب اقفالہا!!

مولانا محترم! یہ شخص محض ابوالفضل یا فیضی نہیں، ..... ہے۔ اس نے شاطبی پر پی ایچ ڈی کیا ہے، کسی واقفِ حال نے کہیں کہہ دیا کہ یہ ..... شاطبی کو پڑھ ہی نہیں سکتا۔ کسی نے یہ بات اس تک پہنچادی، اب اس نے کونسل کے بجٹ سے عربی پڑھانے کے لئے ایک عراقی کو رکھ لیا ہے۔ یہ اندھی اور بہری قوم خاموش ہے۔ اگر اندر جھانکیں تو اس قوم کا پیسہ نہایت بے دردی کے ساتھ ضائع کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی زبان، آپ کے علم اور آپ کی قلم میں برکت دے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ نے استقامت دکھائی تو ..... بھاگ جائے گا۔ والسلام

اخو کم فی الاسلام، کراچی

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ وأصحابہ أجمعین

حافظ محمد زبیر

تعارف و تہرہ کتب

## غامدی صاحب: علماء کی نظر میں

مصنفین: مفتی ذیشان پنجوانی، مفتی فیصل خورشید جاپان والا، مفتی کمال الدین مسٹر شد

خفامت: ۱۶۰ صفحات سال اشاعت: ۲۰۰۸ء قیمت: ۲۰۰

ملنے کا پتہ: المصباح ناشران قرآن و کتب اسلامیہ: ۱۶/اردو بازار، لاہور

کتاب دیکھنے میں عمدہ اور ٹائٹل، کاغذ اور طباعت کا معیار اچھا ہے۔

● کتاب کے مصنفین تو ایک سے زائد ہیں لیکن ٹائٹل پر نام صرف مفتی فیصل جاپان والا لکھا ہوا ہے حالانکہ مفتی فیصل صاحب نے اس کتاب کے تقریباً ۲۵ صفحات لکھے ہیں۔ اس کتاب کا اکثر و بیشتر حصہ مفتی ذیشان پنجوانی صاحب کا ہے جنہوں نے غامدی صاحب کے نظریات پر نقد کرتے ہوئے تقریباً ۹۰ صفحات رقم کیے ہیں۔ یہ بات بہت ہی قابل تعجب ہے کہ مفتی فیصل جاپان والا کو، جن کے اس کتاب میں صرف ۲۵ صفحات ہیں، کتاب کا محقق قرار دیا گیا ہے۔ پھر یہ امر بھی ناقابل فہم ہے کہ مفتی ذیشان صاحب، جن کا اس کتاب کے تحقیقی مواد میں سب سے زیادہ حصہ شامل ہے، ان کو مفتی فیصل صاحب کے معاونین کی فہرست میں داخل کیا گیا ہے۔

حق تو یہ تھا کہ اس کتاب کی نسبت مفتی ذیشان صاحب کی طرف کی جاتی اور ٹائٹل پر انہی کا نام ہوتا لیکن محسوس یہ ہوتا ہے کہ مفتی فیصل صاحب نے اس تحقیقی پروجیکٹ کے سپروائزر ہونے کا فائدہ حاصل کیا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اب تک صرف پروفیسر حضرات اس حوالے سے بدنام تھے کہ وہ یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلباء سے مختلف موضوعات پر اپنی زیر نگرانی میں اسائنمنٹس لکھواتے ہیں اور بعد میں اپنی سپروائزری کا حصہ وصول کرنے کے لیے طلباء کی اس تحقیق کو اپنے نام سے شائع کر دیتے ہیں۔ اب تو لگتا ہے دارالعلوم کے مفتیوں نے بھی یہی کام شروع کر دیا ہے۔

◉ بہر حال ہم اس کتاب کے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے بتایا ہے کہ یہ کتاب تقریباً ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اگر ہم مواد کے اعتبار سے اس کو تقسیم کریں تو اس کتاب کے تقریباً ۹۰ صفحات مفتی ذیشان پنجوانی صاحب، ۲۵ صفحات مفتی فیصل جاپان والا، ۱۷ صفحات مفتی کمال الدین مسٹر شد اور ۲۳ کے قریب صفحات مختلف تبصرہ نگاروں کے ہیں۔ اس ساری کتاب پر تبصرے کے لیے تو ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے لیکن فی الحال ہمارے پیش نظر اس وقت اس کتاب کے وہ صفحات ہیں جو کہ اس کتاب کے تحقیقی پراجیکٹ کے سپروائزر جناب مفتی فیصل جاپان والا نے تحریر فرمائے ہیں۔ اس کتاب میں جناب مفتی صاحب نے اس خواہش کا اظہار بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی صاحب اس کتاب میں کوئی غلطی دیکھیں تو اس سے مطلع فرمائیں۔ ہم نے ایک خط جناب مفتی صاحب کو بھی ارسال فرما دیا ہے اور بعض دوستوں کی خواہش پر اس کتاب کا تبصرہ عامۃ الناس کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔

◉ سب سے پہلے تو ہم یہ کہیں گے کہ اس کتاب کا عنوان ہی غلط ہے۔ یعنی 'غامدی صاحب: علماء کی نظر میں' کیونکہ علماء کرام کے فرمودات کوئی ایسی حتمی میزان اور یقینی کسوٹی نہیں ہیں جن کے اقوال کی روشنی میں کسی شخص کے افکار و نظریات کو پرکھا جائے اور ان کے حق و باطل کا فیصلہ کیا جائے۔ خصوصاً جبکہ علماء بھی ایسے ہوں، جو دینی علوم میں بس اس قدر ہی پختگی رکھتے ہوں کہ ان کے پاس کسی دارالعلوم سے فراغت کی سند موجود ہو۔ درحقیقت اصل میزان 'کتاب و سنت' ہیں۔ اگر اس کتاب کا تحقیقی پراجیکٹ یہ ہوتا کہ 'غامدی صاحب: کتاب و سنت کی روشنی' میں تو یہ ایک درست عنوان تھا۔

◉ اس کتاب کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ غیر جانبدار ہو کر لکھی گئی ہے، حالانکہ کوئی بھی صاحب علم جس نے غامدی صاحب کے افکار کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کیا ہو، اس کتاب کے صفحہ ۱۷ تا ۳۷ کے بارے میں یہ تبصرہ کیے بغیر نہ رہ سکے گا کہ یہ انتہائی جانبدارانہ تحریر ہے۔ اور اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

① علماء کی آرا کو غامدی صاحب کی آرا سے موافق بنانے کے لیے توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ مفتی فیصل صاحب نے کہا کہ "علماء تصویر کو جائز کہتے ہیں اور غامدی صاحب بھی جائز

کہتے ہیں لہذا اختلاف کہاں؟“ حالانکہ دونوں کے موقف میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جن علماء کے نام مفتی صاحب نے بیان کیے ہیں، اگر انہوں نے واقعاً ان علما کا موقف پڑھا ہوتا یا پڑھنے کے بعد ان کو سمجھ بھی آیا ہوتا تو وہ یہ بات کبھی بھی نہ لکھتے۔ جن علما کی انہوں نے بات کی ہے، وہ کیمرے کی تصویر کو جائز قرار دیتے ہیں نہ کہ ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویر یا مجسمہ سازی کو، جبکہ غامدی صاحب ہاتھ سے بنائی ہوئی تصاویر اور مجسمہ سازی کو نہ صرف جائز قرار دیتے بلکہ بعض صورتوں میں مطلوب بھی خیال کرتے ہیں۔

② مردوں کا ٹخنہ ڈھانکنا جائز ہے۔ اس بارے میں بعض عرب علماء کے موقف کا مفتی صاحب نے تذکرہ کیا ہے لیکن ان کے حوالہ جات مذکور نہیں ہیں۔ ایک تحقیقی کتاب کا یہ خاصہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس میں بغیر کسی حوالے کے کوئی بات درج کر دی جائے جیسا کہ مفتی صاحب نے بعض مقامات پر ایسا کیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی عالم کی طرف کسی بات کی نسبت کی بھی جائے تو اس عالم کی اصل عبارت نقل کی جائے تاکہ علما کو یہ معلوم ہو سکے کہ نام نہاد مصنف و محقق کو کسی عالم کا نقطہ نظر سمجھنے میں کہاں غلطی لگی ہے؟

③ مفتی صاحب کہتے ہیں کہ بعض علمائے سلف کے نزدیک بھی عورت کا چہرہ پردہ میں شامل نہیں ہے اور غامدی صاحب بھی یہی کہتے ہیں تو فرق کیا ہوا؟ حالانکہ مفتی صاحب اس بات سے بخوبی واقف ہوں گے کہ غامدی صاحب صرف چہرے کے پردے کی بات نہیں کرتے بلکہ سر کے دوپٹے کو بھی دینی حکم نہیں سمجھتے۔ دوسری بات جو مفتی صاحب نے متقدمین احناف اور علامہ البانیؒ کے بارے میں لکھی کہ وہ چہرے کے پردے کے قائل نہ تھے، حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کو واجب نہیں سمجھتے جبکہ مستحب ہر حال میں قرار دیتے ہیں تفصیل کے شائق علامہ البانیؒ کی کتاب الرد المفحم علی من خالف العلماء وتشدد وتعصب وألزم المرأة بستر وجهها وكفيتها وأوجب ولم يقتنع بقولهم: إنه سنة ومستحب، ملاحظہ فرمائیں۔

علامہ البانیؒ نے اپنی کتاب جلباب المرأة المسلمة کے مقدمے میں لکھا ہے کہ



میں اپنی بیوی و بیٹی کے لیے چہرے کے پردے کو پسند کرتا ہوں اور انہیں اس کی تلقین بھی کرتا ہوں۔ کہاں علامہ البانی کا یہ موقف اور کہاں مفتی صاحب کا علامہ البانی پر یہ بہتان کہ وہ چہرے کے پردے کے قائل نہیں ہیں۔ اسی طرح متقدمین احناف فتنے کے حالات میں اس کو واجب بھی قرار دیتے ہیں۔ تفصیل کے لیے 'چہرہ کا پردہ: واجب، مستحب یا بدعت' نامی کتاب ویب سائٹ [www.tanzeem.org](http://www.tanzeem.org) پر ملاحظہ فرمائیں۔

واضح رہے کہ ہمیں علامہ البانی کے اس موقف سے اتفاق نہیں ہے اور علامہ البانی اور ان کے متبعین کے دلائل کا جواب اپنی ایک کتاب میں مفصل طور پر دے دیا ہے جو زیر طبع ہے۔

② مفتی صاحب کا دعویٰ ہے کہ بعض علمائے اہل سنت کے نزدیک بھی صاف ستھری موسیقی سننا جائز ہے، اور اپنی بات کو بناتے ہوئے انہوں نے حوالوں کے اضافے کے لیے خواہ مخواہ ایک منکر حدیث جعفر شاہ پھلوری کو مولانا کے لقب سے نواز دیا۔ اس منکر حدیث کے تفصیلی افکار جاننے کے لیے اس کی کتاب 'مقام سنت' کو ملاحظہ فرمائیں۔ اس مسئلے میں انہوں نے دو حوالے پیش کیے ہیں: ایک امام غزالی کا اور دوسرا جعفر پھلوری کا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ امام غزالی کا موقف شاذ ہے اور صوفیت کی بنا پر امام غزالی میں اس مسئلے میں نرمی آئی ہے۔ جبکہ مذاہب اربعہ کے فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ موسیقی حرام ہے۔ اس موضوع پر محدث العصر علامہ البانی کی کتاب تحریم آلات الطرب کا مطالعہ مفتی صاحب کے لیے مفید رہے گا۔

⑤ داڑھی کے بارے میں مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے بھی تو داڑھی کے بارے میں کہا کہ "داڑھی کاٹنا جائز ہے اور رکھنا ثواب ہے۔" اور غامدی صاحب کا بھی یہی موقف ہے تو غامدی صاحب پر نقد کیوں؟ وہبہ زحیلی کے اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ داڑھی رکھنا مستحب ہے اور استحباب حکم شرعی کی ایک قسم ہے یعنی داڑھی رکھنا ایک شرعی حکم ہے اور دین کا موضوع ہے۔ کیا غامدی صاحب بھی داڑھی کے بارے میں یہی موقف رکھتے ہیں؟

⑥ مفتی صاحب کا کہنا یہ بھی ہے کہ غامدی صاحب کی طرح بعض اہل سنت بھی قراءات کو

نہیں مانتے ہیں اور جب مفتی صاحب نے ان علما کے نام پیش کیے جو کہ قراءات کے منکر ہیں تو اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے خواہ مخواہ ان علما کا رتبہ بڑھاتے ہوئے ان کو ایسے القابات سے نوازا، جن کے وہ اہل نہیں ہیں۔ پس سب سے قراءات کے مسئلے میں ایک منکر حدیث جعفر شاہ پھلواڑی کو امام الصوفیاء، منکر قرآن و حدیث اور ایک ملحد شخص تمنا عمادی کو محدث العصر اور ایک منحرف و گمراہ کن افکار کے حامل مولوی محمد اسحق صدیقی کو امام اہل سنت کے القاب سے نوازا گیا۔ اس نام نہاد محدث العصر کی میدان حدیث میں خدمات جاننے کے لیے اس کی کتاب ’تصویر کے دورخ: ابن جریر طبری اور ابن شہاب زہری‘ ملاحظہ فرمائیں۔ میرا یہ گمان نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس محدث العصر کی تمام کتابیں پڑھنا تو کجا، مفتی صاحب نے دیکھی بھی نہ ہوں گی۔ تو اس شخص کو محدث العصر کا لقب انہوں نے کیسے نوازا دیا؟ اسی طرح نام نہاد امام اہل سنت کے بعض گمراہ کن افکار کو جاننے کے لیے راقم کے ایک مضمون ’نزل عیسیٰ ابن مریم ایک افسانہ یا حقیقت‘ کا مطالعہ محولہ بالا ویب سائٹ پر کریں۔ علاوہ ازیں عموماً ایسے علما کے نام پیش کیے گئے ہیں جنہیں ان کے مذہبی حلقوں میں ہی متجددین کی فہرستوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

④ سنت کے مسئلے کو مفتی صاحب نے کھینچ تان کر شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اس بارے میں شاہ صاحب کا جتہ اللہ البالغہ کے مقدمہ میں صرف اتنی بات کہنا ہی کافی ہے کہ میری اس کتاب میں جو بات بھی اُمت کے اجماع اور جمہور علما کے موقف کے خلاف ہوگی، میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ شاہ صاحب کا نقطہ نظر جاننے کے لیے ’شاہ ولی اللہ کے اُصول فقہ‘ نامی کتاب کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ شاہ صاحب کا تصور سنت کیا تھا۔ آیا ان کا موقف وہ ہے جو مفتی صاحب اور غامدی صاحب بیان فرما رہے ہیں یا وہ جو کہ تمام اُمت کا رہا ہے یعنی سنت سے مراد حدیث ہی ہے۔

⑤ مفتی صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ سنت کے معنی و مفہوم میں صرف تعبیر کا فرق ہے۔ فقہائے احناف نے بھی سنت کے لفظ کو سنن الہدیٰ اور سنن الزوائد کی صورت میں متعارف کر دیا ہے۔ غامدی صاحب کی بے جا تائید میں مفتی صاحب نے یا تو خلط

بحث سے کام لیا ہے یا پھر اصل بات ان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ غامدی صاحب نے سنت کی بحث کا تذکرہ بطور مصدرِ شریعت کیا ہے اور اس کی تعریف مصدرِ شریعت ہونے کے اعتبار سے بیان کی ہے۔ مفتی صاحب اس کا جواب دیں کہ سنت کو جب شاہ صاحب یا فقہائے احناف بطور مصدرِ شریعت بیان کرتے ہیں تو ان کی مراد سنن الہدیٰ ہوتی ہے یا آپ کا قول، فعل اور تقریر۔ تفصیل کے لیے امام بھصا حنفی کی الفصول اور ابن امیر حاج حنفی کی التقریر والتجہیر اور شاہ صاحب کی حجة الله البالغة کا مطالعہ کریں۔

⑨ مفتی صاحب کہتے ہیں کہ غامدی صاحب کے نزدیک بھی حدیث حجت ہے لہذا ان کے نظریہ حدیث پر نقد کیوں؟ میں یہ کہتا ہوں کہ جمیع اہل سنت کے نزدیک حدیث مستقل بالذات ماخذِ دین ہے اور غامدی صاحب حدیث کو مستقل بالذات ماخذِ دین نہیں سمجھتے۔ اگر غامدی صاحب حدیث کو مستقل بالذات ماخذِ دین سمجھتے ہیں تو ان سے یہ بات لکھوا کر دستخط کروالیں۔ سارا تنازع ختم ہو جائے گا اور ہمارے نزدیک اختلاف محض لفظی رہ جائے گا۔ غامدی صاحب کے اصول و مبادی کے پہلے صفحے کی جس عبارت کا حوالہ مفتی صاحب نے دیا ہے کہ جس کو پڑھ کر وہ پریشان بھی ہو گئے تھے، اس عبارت کا حقیقی مفہوم کیا ہے اس کے لیے ہماری کتاب 'فکر غامدی: ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ' کے نئے ایڈیشن کا انتظار فرمائیں۔ ان شاء اللہ غامدی صاحب اور اہل سنت کی تعبیر میں فرق کے اعتبار سے ان کے معتد بہ علم میں اضافہ ہوگا۔

⑩ میرے خیال میں مفتی صاحب کو غامدی صاحب کی فکر سمجھنے کے لئے ابھی خاصا وقت درکار ہے اور اس سے بھی زیادہ وقت فقہائے احناف اور اہل سنت کے تصورات کو سمجھنے کے لیے درکار ہے۔ مفتی صاحب کہتے ہیں کہ اختلاف صرف تعبیر کا ہے اور غامدی صاحب اہل سنت میں شامل ہیں۔ ہمیں کوئی شوق نہیں ہے کہ ہم غامدی صاحب کو اہل سنت سے خارج کریں۔ لیکن غامدی صاحب کسی نص کے فہم پر اُمتِ مسلمہ تو کیا، صحابہؓ کے اجماع کے بھی قائل نہیں ہیں۔ صحابہؓ کے جس اجماع کو وہ حجت مانتے ہیں، وہ کسی چیز کے بطورِ دین ثابت ہونے پر صحابہؓ کا اجماع ہے نہ کہ کسی نص کے فہم پر۔ صحابہؓ کے اجماع کو حجت نہ

ماننے اور ان سب صحابہؓ کے اتفاقی موقف سے اختلاف کرنے کے باوجود ایک شخص اہل سنت یعنی صحابہؓ کے منہج پر کیسے شمار ہوگا؟

⑪ مفتی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ فطرت و شریعت کے حرام کردہ امور میں محض تعبیر کا اختلاف ہے تو ذرا مفتی صاحب فطرت کی بنیاد پر محرمات کی فہرست تو مرتب کر کے دکھائیں تو معلوم ہو جائے کہ تعبیر کا اختلاف ہے یا نہیں؟ غامدی صاحب نے فطرت کی بنیاد پر اصول و مبادی پڑھاتے ہوئے مینڈک کے کھانے کو جائز قرار دیا ہے جبکہ سنن ابودود کی ایک روایت کے مطابق مینڈک کو قتل کرنے سے آپؐ نے منع کیا ہے جس سے فقہا کرام نے اس کی حرمت پر استدلال کیا ہے۔ اگر واقعاً تعبیر کا ہی اختلاف ہے تو ’الشریعہ‘ کی ویب سائٹ پر میرا تقریباً ایک سو دس صفحات کا مقالہ اس موضوع پر ملاحظہ فرمائیں اور اس میں بیان کیے گئے شرعی دلائل کی شافی وضاحت کریں۔

⑫ ایک مسئلے میں مفتی صاحب نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ وہ تو متعہ کے بھی قائل تھے اور گدھے کی حرمت کے بھی انکاری تھے۔ علما کے شاذ اقوال کو دلیل بنانا اور ان سے استدلال کرنا اہل سنت کے نزدیک اہل بدعت کا منہج ہے تفصیل کے لیے اس موضوع پر ماہنامہ ’محدث‘ بابت اپریل ۲۰۰۵ء میں ایک عرب عالم دین شیخ فہد بن سلیمان العودہ کا مفصل مقالہ بعنوان ’اجتہاد کا حق دار کون؟‘ مطالعہ فرمائیں۔

⑬ حضرت عبداللہ بن عباسؓ متعہ کے قائل تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ متین کو قرآن میں شمار نہیں کرتے تھے۔ حضرت ابودرداءؓ سونے چاندی کو اپنے پاس رکھنے یا جمع کرنے کو حرام قرار دیتے تھے۔ اسی طرح ابن عباسؓ گدھے کی حرمت کے قائل نہیں ہیں۔ امام مالکؒ کے نزدیک شیر، چیتا، رچھ، مگر، مچھ، بلی، لکڑ بھگڑ، سانپ، بچھو، کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض وغیرہ سب حلال ہیں۔ امام ابن حزمؒ ایک ہالٹی پانی میں ایک جگ پیشاپ اُنڈیل دیں تو پھر بھی اس کی پاکی کے قائل ہیں۔ متقدمین احناف نے مفقود الخبر شخص کی بیوی کو ۹۵ سال انتظار کرنے کا فتویٰ جاری کیا وغیرہ ذلک۔ امام غزالیؒ نے موسیقی کو جائز قرار دیا تو مولانا رومی نے اس کے ساتھ دھمال و رقص کو بھی دین کا حصہ

بنا دیا۔ اس پر مستزاد آج کے بریلوی علماء میں جنہوں نے شرک و بدعت کو سند جواز عطا کیا ہے حالانکہ ان کے پاس بھی اسی درسِ نظامی اور افتاء کورس کی سند ہے جو ان مفتی صاحب کے پاس ہے۔

اس قسم کے فتاویٰ و شاذ اقوال پر ایک کتاب مرتب کی جاسکتی ہے لیکن آپ ذرا غور فرمائیں، اگر کوئی شخص علماء کے ان تمام شاذ اقوال کو جمع کر لے تو کیا اس کے مذہب اور قرآن و سنت کے بیان کردہ دین میں کوئی ذرا برابر بھی مماثلت باقی رہ جائے گی؟ اگر ان سب یعنی دیوبندی، اہل حدیث، بریلوی علماء وغیرہ کے فتاویٰ ہی کو ایک شخص جمع کر کے ایک موقف بنا لے تو اس سے ایک نئی جماعت المسلمین تو مسلمان ثابت ہو سکتی ہے جو ان تینوں کے علاوہ ہو لیکن یہ تینوں گروہ نہیں؟

(۱۳) مفتی صاحب نے علماء کی ایک فہرست بھی پیش کی ہے کہ جن کی ملاقات انہوں نے غامدی صاحب سے کروائی ہے اور ان علما نے بقول ان کے غامدی صاحب کے گمراہ نہ ہونے کی سند بھی عطا فرمائی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے سے ہم گزر رہے ہیں، یہ نقطہ الرجال کا دور ہے۔ اب مدارس کے طلباء اور فارغ علما و مفتی حضرات کا مبلغ علم وہ نہیں ہوتا جو آج سے ستر، اسی سال پہلے تھا۔ جامعہ اشرفیہ کے ایک شیخ الحدیث فرماتے تھے کہ دوسو طلبہ دورہ حدیث میں ہیں اور ان میں چار یا پانچ وہ ہیں کہ جن کو واقعاً کچھ آتا بھی ہے۔ اسی طرح جامعہ اشرفیہ کے ایک استاد مولانا سرفراز صاحب ایک دفعہ ایک مجلس میں فرمانے لگے کہ تخصص کے کورسز سب سے بڑی خرابی یہ لے کر آئے ہیں کہ گلی گلی مفتی پیدا کر دیے ہیں اور بغیر کسی رسوخ فی العلم کے وہ دھڑا دھڑ فتوے جاری کرتے ہوئے انتشارِ ذہنی بڑھا رہے ہیں۔ دوسری طرف درسِ نظامی میں اساتذہ کی ضرورت کا مسئلہ پیش آئے تو نامور دارالعلوموں سے فارغ التحصیل کئی مفتی حضرات جو کہ تین، تین سال سے کنز الدقائق، الہدایہ اور تفسیر جلالین جیسی کتابیں پڑھا رہے تھے، ان کا جب امتحان لیا جاتا ہے تو تدریس کی مطلوبہ لیاقت کسی میں نہیں ہوتی۔ درسِ نظامی کے کئی فارغ التحصیل جب مزید تعلیم کے لیے کسی جگہ داخلہ حاصل کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا معیار علم کیا

ہے؟ اس لیے جن علما سے آپ نے غامدی صاحب کی ملاقاتیں کروائی ہیں، دنیا ان علما کو نہیں جانتی۔ دنیا تو جن کو علماء سمجھتی اور جانتی ہے، وہ مولانا تقی عثمانی ہیں یا مولانا سلیم اللہ خان صاحب، ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر صاحب ہیں یا مفتی ڈاکٹر عبدالواحد صاحب، مولانا ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب ہیں یا مولانا عبدالرحمن مدنی صاحب، مولانا زاہد الراشدی صاحب ہیں یا مولانا مفتی زرولی صاحب۔ مولانا ارشاد الحق اثری صاحب ہیں یا مولانا مبشر ربانی صاحب۔ ایسے علما سے آپ غامدی صاحب کی ملاقات کروائیں اور ان کی آراء لیں، اس سے عوام الناس کو بھی فائدہ ہوگا اور آپ کو بھی حقیقی فائدہ۔

⑮ آپ کی اس بات کی میں قدر کرتا ہوں کہ ہمیں غامدی صاحب کے بارے میں غیر جانبدار ہو کر سوچنا چاہیے لیکن اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ آپ کی سوچ و تحقیق غیر جانبدار ہے یا نہیں؟ اسی طرح آپ کی یہ بات بھی قابل قدر ہے کہ علماء کو غامدی صاحب کے بارے میں ان کو پڑھ کر کوئی رائے قائم کرنی چاہیے لیکن مفتی صاحب یہ جو تاثر دینا چاہتے ہیں کہ تمام علما غامدی صاحب کو پڑھے بغیر ہی ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں، بالکل غلط ہے۔ ہم مفتی صاحب سے یہ پوچھتے ہیں کہ جن علماء نے غامدی صاحب کو پڑھ کر ان پر تنقید کی ہے، ان علما کی نقد کا مفتی صاحب کے پاس کیا جواب ہے؟ جن میں مولانا رفیق چوہدری کی کتاب ’مذہب غامدی کیا ہے؟‘ مفتی ڈاکٹر عبدالواحد کی کتاب ’تحفہ غامدیت‘، مولانا زاہد الراشدی صاحب کی کتاب ’ایک علمی و فکری مکالمہ‘، مولانا ارشاد الحق اثری کی کتاب ’موسیقی کی حرمت‘، مولانا مبشر حسین لاہوری کی کتاب ’موسیقی حرام نہیں؟‘، راقم الحروف اور حافظ طاہر الاسلام عسکری کی کتاب ’فکر غامدی: ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ‘، مجلس تحفظ حدیث فاؤنڈیشن کراچی کی کتاب ’اصول و مبادی پر تحقیقی نظر‘ شامل ہیں۔ ایسے ہی ماہنامہ ساحل، ماہنامہ محدث اور ماہنامہ الشریعہ میں مختلف علماء کی طرف سے شائع ہونے والے تحقیقی مقالہ جات وغیرہ۔ کیا مفتی صاحب نے ان سب کتابوں و مضامین کا مطالعہ کر لیا ہے اور اگر کیا ہے تو ان کے پاس ان اعتراضات کا کیا جواب ہے جو یہ علما غامدی صاحب پر وارد کرتے ہیں۔ کیا مفتی صاحب کے خیال میں یہ سب علماء

غامدی صاحب کی کتاب کے حوالے جب اپنی تحریروں میں نقل کرتے ہیں تو اپنی جیبوں سے نکال کر نقل کرتے ہیں یا انہوں نے غامدی صاحب کو پڑھا بھی ہوتا ہے؟

(۱۶) میں نہ تو غامدی صاحب کی تکفیر کا مدعی ہوں اور نہ ہی ان کے منکر حدیث ہونے پر مصر، لیکن ان کے افکار گمراہ کن ضرور ہیں۔ اور یہ افکار جس کے بھی ہوں کسے باشندہ وہ بھی گمراہ کن افکار کا حامل ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ امام غزالی نے اپنی شروع کی زندگی کے افکار و نظریات کے بارے میں المنقذ من الضلال یعنی گمراہی سے نکلنے والا، نامی کتاب لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک بڑے عالم دین کو بھی کسی مسئلے میں غلطی لگ سکتی ہے۔

قراءات قرآنیہ متواتر ہیں اور ان کا منکر اسباب کفر میں سے ایک سبب کا حامل ہے لیکن موانع اور شروط کی وجہ سے اس کی تکفیر نہ کی جائے گی۔ آپ کہتے ہیں کہ فلاں عالم نے لکھا ہے کہ قراءات متواتر نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مراکش، الجزائر، تونس، لیبیا، موریتانیہ، سوڈان اور افریقہ کے تقریباً چالیس ممالک کے کروڑوں مسلمان روایت وراثہ روایت دوری اور روایت قالون میں قرآن پڑھ رہے ہیں، کیا اب بھی قراءات متواتر نہیں ہیں؟ کیا سورج کے طلوع ہونے کے بعد کوئی سر پھر اس کا انکار کر دے تو اس کے انکار کو بطور دلیل نقل کر دینا چاہیے؟ میں یہ کہتا ہوں کہ جن نام نہاد علماء نے لکھا ہے کہ قراءات متواتر نہیں ہیں، وہ تو اتر کے مفہوم سے بھی واقف نہیں ہیں۔ تو اتر کا حقیقی مفہوم جاننے کے لیے ہماری کتاب 'فکر غامدی' کا نیا ایڈیشن ملاحظہ فرمائیں۔ اور اپنے محدث العصر کے نظریات جاننے کے لیے اور اس کے افکار کی تردید کے لیے حنفی عالم دین قاری محمد طاہر رحیمی کی 'دفاع قراءات' نامی کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔ ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین، ظاہریہ، محدثین اور امام ابن تیمیہ و ابن قیم جیسے محققین کے علمی اتفاق کے بعد بھی آپ کو قراءات کے قرآن ہونے کا یقین حاصل نہیں ہوتا تو آپ کا اللہ ہی حافظ ہے۔ جن علماء نے قراءات کا انکار کیا ہے تو وہ غلطی پر ہیں اور ان کے افکار گمراہ کن ہیں۔ تفصیل کے لیے فکر غامدی کا نیا ایڈیشن ملاحظہ فرمائیں۔

⑫ غامدی صاحب قراءات کو قرآن نہیں مانتے، گویا قرآن کے ایک جز کے منکر ہیں، حدیث کو مستقل بالذات ماخذ دین نہیں مانتے اور صحابہ و اُمت کے کسی نص کے فہم پر اجماع کو حجت نہیں سمجھتے۔ یہ میرے نزدیک تین ایسی بنیادیں ہیں کہ جن پر جمیع اہل سنت ائمہ اربعہ، ظاہریہ اور محدثین کا اتفاق ہے اور ان کے انکار کی وجہ سے غامدی صاحب اہل سنت کے منہج پر نہیں ہیں اور جس عالم دین میں بھی یہ تین یا ان میں سے کوئی ایک بنیاد پائی جاتی ہے وہ اہل سنت کے منہج پر نہیں ہے۔

مفتی صاحب سے باتیں تو بہت سی کرنے والی ہیں لیکن فوری طور پر یہی باتیں ان کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ مفتی صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ لاہور کے ایک عالم دین مولانا محمد رفیق چوہدری، جاوید احمد غامدی کے بارے میں علماے دیوبند، علماے اہل حدیث اور علماے بریلویہ کے فتاویٰ جمع کر رہے ہیں۔ مفتی صاحب ان سے ضرور رابطہ کیجیے گا۔ کیونکہ ان کا موضوع بھی یہی ہے یعنی ’غامدی صاحب: علماء کی نظر میں‘۔ اور وہ علما، ایسے ہیں جن کو دنیا علما کہتی ہے نہ کہ فارغ التحصیل کے ساتھ فارغ العلم مفتی حضرات بھی!!

### کتاب کے دیگر حصوں پر ایک نظر

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کتاب کے بقیہ حصوں پر بھی تھوڑی بہت روشنی ڈال دیں۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس کتاب کا پہلا حصہ مفتی فیصل جاپان والا کا ہے جو کہ ۲۵ صفحات پر مشتمل ہے جبکہ دوسرا حصہ مفتی کمال الدین مسٹر شد کا ہے جو ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں مفتی صاحب نے غامدی صاحب کے نظریہ فطرت پر نقد کی ہے۔

مفتی صاحب کی اس ساری بحث کا خلاصہ دو نکات پر مبنی ہے: پہلا نکتہ سلف صالحین اور ائمہ متقدمین سے جڑے رہنے کی تلقین اور ان کے اجماعی موقف سے انحراف کی مذمت پر مشتمل ہے کہ جس سے ہمیں کلی طور پر اتفاق ہے۔

جبکہ دوسرا نکتہ بیان کرتے ہوئے مفتی صاحب نے اجتہاد کے دروازے کو بند کرنے اور تقلید جامد پر اکتفا کرنے کو مسلمانوں کا اجماعی موقف قرار دیا ہے۔ بھلا کوئی مفتی صاحب سے یہ پوچھے کہ فطرت کی بحث کا تقلید جامد سے کیا تعلق ہے؟ مفتی صاحب نے اپنی بات کی دلیل



کے طور پر علامہ ابن خلدون (متوفی ۸۰۸ھ) کا ایک قول بھی نقل کیا ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان چار اماموں کی تقلید پر متفق ہیں، حالانکہ وہ علامہ ابن خلدون کی عبارت کا صحیح مفہوم سمجھ نہ سکے۔ ایک طرف ایک مفتی فیصل صاحب اس انتہا پر ہیں کہ غامدی صاحب کے گمراہ کن نظریات کو علما کے شاذ اقوال کی چھتری کا سایہ فراہم کرنے پر تلے ہوئے ہیں جبکہ اسی کتاب میں دوسرے مفتی کمال الدین صاحب ایک دوسری انتہا پر ہیں کہ غامدی صاحب کوائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید کا مشورہ فراہم کر رہے ہیں۔ مفتی صاحب ذرا یہ بتائیں کہ صحابہ و تابعین کے دور میں عامۃ الناس ائمہ اربعہ میں سے کس امام کی تقلید کرتے تھے؟ میں تو یہ کہتا ہوں کہ چودہ صدیوں میں کوئی ایک سال بھی اُمتِ مسلمہ پر ایسا نہیں گزرا ہے کہ جس میں تمام مسلمانوں نے صرف ائمہ اربعہ ہی کی تقلید کی ہو۔

علامہ ابن خلدون (۸۰۸ھ) کے دور سے پہلے امام ابن حزم (۴۵۶ھ)، امام ابن تیمیہ (۷۲۸ھ) اور محدثین کی ایک بڑی جماعت غیر مقلد تھی اور ان کے متبعین آج بھی دنیا کے مختلف خطوں میں اہل الحدیث، سلفیہ اور اثیریہ وغیرہ کے القاب سے موجود ہیں۔

سینکڑوں مسائل ایسے ہیں جو ہر دور میں تہذیب و تمدن کے ارتقا سے پیدا ہوتے رہے ہیں اور جن کی مثال تک متقدمین کے زمانے میں نہیں ہوتی تھی اور علماے احناف ان مسائل کا حل پیش کرتے رہے ہیں۔ یہ اجتہاد نہیں تو اور کیا ہے؟ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ مفتی حضرات فتویٰ کی زبان سے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیں یا تقلیدِ جامد پر مجبور کر کے علماء کی صلاحیتوں کو زنگ لگا دیں۔ درمیان کی راہ یہی ہے کہ سلف کے منہج، فہم اور اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا جائے اور کسی ایک مذہب کی تقلید پر اصرار کرنے کی بجائے من جملہ سلف کی تمام معروف و مشہور آرا کے دائرے میں رہنے کی تلقین کی جائے اور اس دعویٰ میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ سوائے برصغیر پاک و ہند کے حنفی علماء کی ایک جماعت کے سارے عالم اسلام میں اسی منہج پر کام ہو رہا ہے۔

آج سے تقریباً ۷۰، ۸۰ سال پہلے ہی مصر کے حنفی علما نے طلاقِ ثلاثہ کے مسئلے میں امام ابن تیمیہؒ کی رائے کو اختیار کر لیا تھا اور اس کو مصر میں قانون کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس کے

علاوہ انڈونیشیا، ملائیشیا، مراکش، الجزائر، افریقہ، یمن، قطر، سعودی عرب، کویت، اردن، شام، تیونس، لیبیا اور متحدہ عرب امارات وغیرہ میں بھی کسی امام کی تقلید پر زور دینے کی بجائے تمام ائمہ اسلاف کو اپنا علمی ورثہ سمجھتے ہوئے ان سے استفادہ کی فکر و منہج بہت تیزی سے علماء میں پھیل رہی ہے جس کی ایک بہترین مثال علما کے مختلف عالمی جمععات اور ان کے فتاویٰ ہیں۔ ان شاء اللہ برصغیر کے علما بھی عنقریب اسی منہج کی طرف آئیں گے۔

اس کتاب کا تیسرا اور بڑا حصہ وہ ہے کہ جس کے مؤلف جناب مفتی ذیشان پنجواری صاحب ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں تقریباً ۹۱ صفحات میں غامدی صاحب کے اصول و مبادی پر نقد کی ہے۔ مفتی صاحب نے غامدی صاحب کے نظریہ قراءات، تصور سنت اور قرآن و سنت کے باہمی تعلق کے حوالے سے نقطہ نظر پر اپنی تحقیق پیش کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مفتی صاحب نے واقعتاً اس حصے کی تالیف میں بڑی محنت صرف کی ہے۔ ایک آدھ مقام پر مفتی صاحب نے غامدی صاحب سے اتفاق بھی کیا ہے جیسا کہ انہوں نے قرآن کی تعریف میں غامدی صاحب کی تعریف کو درست قرار دیا ہے جبکہ اکثر و بیشتر مسائل میں انہوں نے غامدی صاحب کے برعکس علما کے عام نقطہ نظر ہی کی حمایت کی ہے اور اسے درست قرار دیا ہے۔

اس حصے کی بعض تحقیقات سے تو ہمیں اتفاق ہے جبکہ بعض کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ مصنف نے اصل بحث کو نہیں سمجھا جیسا کہ غامدی صاحب کے تصور سنت پر نقد کرتے ہوئے مفتی ذیشان صاحب نے بھی مفتی فیصل صاحب کی طرح فقہاء کی کتابوں سے حوالے پیش کرتے ہوئے سنت کا مفہوم متعین کرنا شروع کر دیا۔ سنت کا جو معنی و مفہوم فقہ کی کتابوں میں بیان ہوا ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہے لیکن وہ محل نزاع بھی نہیں ہے۔ غامدی صاحب اور اہل سنت کے درمیان حقیقی محل نزاع تو یہ ہے کہ سنت کا لفظ جب بطور مصدر شریعت استعمال ہوتا ہے تو اس کا معنی کیا ہوتا ہے؟

غامدی صاحب نے ’میزان‘ میں سنت کے لفظ کو بطور مصدر شریعت بیان کرتے ہوئے اس کی ایک تعریف بھی کی ہے۔ اہل سنت جب سنت کے لفظ کو بطور مصدر شریعت بیان کرتے

ہیں تو علم الفقہ کی کتابوں میں اس کا مفہوم نہیں بیان کرتے بلکہ اُصول فقہ کی کتابوں میں مصادرِ شریعت کی بحث کے تحت اس لفظ 'سنت' کا مفہوم واضح کرتے ہیں۔ جبکہ مفتی صاحب نے سنت کا مفہوم واضح کرنے کے لیے اُصول فقہ کی کتابوں کے حوالے ہی نہیں دیے۔

کتاب کے دوسرے اور تیسرے حصے کی تحقیق میں تقریباً غامدی صاحب کی ایک ہی کتاب یعنی 'میزان' ہی کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ جبکہ جامع تحقیق کے لئے ان کی آڈیو، ویڈیو سی ڈیز، ٹیلی ویژن پروگرام، ماہنامہ اشراق اور غامدی صاحب کی ذاتی ویب سائٹ سے بھی استفادہ کیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا، کیونکہ ان کے ذریعے غامدی فکر و نظریہ کو سمجھنا اور پرکھنا زیادہ آسان ہے۔

الغرض پوری کتاب کے مندرجات کو پیش نظر رکھیں تو اس سے غامدی صاحب کی حمایت کی بجائے علماء کی مخالفت کے رجحانات اور اقوال ہی زیادہ میسر آتے ہیں۔ گویا مؤلفین کی اس میزان پر بھی غامدی صاحب پورا نہیں اُترتے اور یہی نتیجہ ظاہر ہوتا کہ اُمتِ مسلمہ کے کسی درجہ کے علمائے کرام کی حمایت بھی انہیں حاصل نہیں ہے۔ جہاں تک کتاب و سنت ہیں تو ان میں تو بہر حال غامدی صاحب کے پیش کردہ مسائل کی جا بجا مخالفت ہی پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ملتِ اسلامیہ کے نت نئے فتنوں کو سمجھنے اور ان سے محفوظ رہنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

آخر میں ملک کے دو موقر دینی اداروں دارالعلوم کراچی اور جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کو یہ توجہ دلانا مناسب ہوگا کہ ان کے فضلا کی زیر نظر تصنیف کی علمی قدر و قیمت ان کے ناموں سے زیادہ ان اداروں سے سندِ فضیلت کی بنا پر ہے۔ قارئین ان نوجوان مفتیانِ کرام کے استدلال کی بجائے ان اداروں کی وقعت کی بنا پر ہی اس تجزیہ کو کچھ وزن دیں گے۔ دونوں محترم مدارس کے ذمہ داران سے گزارش ہے کہ اگر انہیں ان نوجوانوں کی اس نادر تحقیق سے اتفاق ہے تو ان کی تائید فرمائیں، جس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ بصورتِ دیگر اس نوعیت کے حساس موضوعات پر اپنے متعلقین کی درست رہنمائی کر کے دینی فریضے سے عہدہ برا ہوں اور اس کتاب کے بارے میں اپنے ناقدانہ تجزیہ و تبصرہ سے بھی قوم کو مستفید فرمائیں۔

حکیم محمد یحییٰ عزیز ڈاہروی

یادِ رنگان

## نمونہ سلف: حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی

دین اسلام کی تعلیمات کو فروغ دینے کے لئے دعوت و تبلیغ کا کام جس قدر ضروری تھا، آج اُمتِ مسلمہ اس قدر ہی اسے آگے پھیلانے میں سستی سے کام لے رہی ہے۔ انبیاء کرامؑ کے دعوتی مشن کو فروغ دینے کے لئے ہر دور میں اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے خوش نصیب بندے پیدا ہوئے جنہوں نے معاشرے کی اصلاح، شرک و کفر کے رد، ظلم و نا انصافی، قتل و غارت گری، فحاشی و عریانی کے خاتمے اور تعلق باللہ میں رسوخ و پختگی کے لئے اور قرآن و حدیث کی تعلیمات کو فروغ دینے میں اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔

ایسے خوش نصیب حضرات میں ہمارے مدوح متحدہ جمعیت اہلحدیث پاکستان کے امیر اور ادارۃ الاصلاح البدن، بونگہ بلوچاں نزد پھولنگر ضلع قصور کے بانی، ولی کامل نمونہ سلف حضرت حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدیؒ کا شمار بھی ہوتا ہے۔ آپ نے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر اپنی زندگی کو اُمتِ مسلمہ کی اصلاح و تربیت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ آپ کی شخصیت غیر متنازع اور ہر طبقے اور ہر فرد کے لئے قابل احترام تھی۔ آپ کو جس نے ایک بار دیکھا، وہ آپ کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوا۔ آپ کی آواز میں اللہ تعالیٰ نے ایسی حلاوت، گفتگو میں متانت اور اس قدر شیرینی رکھی تھی، خصوصاً جب آپ اپنے مخصوص انداز میں قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تو سخت سے سخت دل میں نرمی پیدا ہو جاتی تھی۔ آپ کی شخصیت نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو کی آئینہ دار تھی۔ کسی کو کافر کہنا، کسی کو منافق قرار دینا، کسی کو بے دینی کی حدوں میں داخل کر دینا یا کسی پر شرک کا فتویٰ لگانا ان کا شیوہ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ آپ کسی کے بارے میں غیبت اور ناشائستہ گفتگو سننا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

## خاندانی پس منظر

آپ کا تعلق راجپوت برادری سے تھا۔ آپ کا خاندان عرصہ دراز سے ضلع قصور کے گاؤں میر محمد میں آباد ہے۔ گردونواح کے تقریباً تمام دیہات میں ان کے خاندان کا ہر اعتبار سے احترام موجود ہے۔ دیانت داری، تقویٰ، سنت رسول کی محبت، شرم وحیا، خیر خواہی، قرآن و حدیث کی تدریس جیسی خوبیوں سے اللہ تعالیٰ نے خاندان میر محمد کو نواز رکھا ہے۔ آپ کے والد گرامی حضرت مولانا حافظ محمد عظیم کے بارے میں ”تذکرۃ الابراہیم از ڈاکٹر عبدالغفور راشد کی کتاب سے چند باتیں ملاحظہ فرمائیں:

”حافظ محمد عظیم انتہائی متقی اور پرہیزگار شخص تھے۔ ایام طفولیت سے ان کا رجحان و میلان عجز و انکساری اور صالحیت اور اتقا کی طرف ہو گیا جو تادم آخر قائم و دائم رہا بلکہ عرفان و سلوک میں انہوں نے ممتاز مقام حاصل کیا اور اسی عزت و تکریم کے ساتھ زندگی کے شب و روز بسر کر دیئے۔ ان کا آبائی تعلق بھوجیان (بھارت) کے مردم خیز قصبے سے تھا، جہاں علم و عرفان کی ایسی قد بلیں اور شمعیں روشن ہوئیں جنہوں نے سر زمین ہند ہی نہیں بلکہ بیرون ہند بھی تاریک وادیوں کو روشن کیا۔ حافظ محمد عظیم کا تعلق ایسے خاندان سے تھا جس کا رجحان اکثر و بیشتر جدال و خصام کی طرف رہا ہے لیکن ان کی بلند بختی کہ ان کے خاندان میں ان کے بڑے بھائی بلند خاں اور چچا مستقیم خاں نے، مولانا فیض اللہ خاں جو افغانستان سے بھوجیان (بھارت) آئے تھے، یعنی حضرت یحییٰ عزیز کے نانا جان، ان کے ذریعے کتاب و سنت کا مسلک اختیار کیا جس کی بنا پر ان کے گھروں میں مروجہ جاہلانہ طرز زندگی کی بجائے اُن اطوار کو اختیار کر لیا گیا تھا جن کا تقاضا کتاب و سنت نے کیا ہے۔ حافظ میر محمدی نے حفظ قرآن کے بعد اخذِ علم کے لیے مدرسہ محمدیہ لکھو کے اور مدرسہ غزنویہ، امرتسر میں قیام کیا لیکن ان کا قلبی اور طبعی رجحان عرفان و سلوک کی طرف تھا۔ لہذا وہ مروجہ علوم دینیہ میں کوئی زیادہ استفادہ نہیں کر سکے۔ اپنی تشنگی کی سیرابی کے لئے وہ زیادہ عرصہ سید محبوب علی شاہ لکھوی اور مولانا صوفی کمال الدین ڈوگر کی خدمت میں رہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان دو شخصیات کی صحبتوں کا رنگ ان کی قبائے حیات پر غالب رہا۔ ان کے زہد و ورع اور سلوک و عرفان کے بارے میں لوگوں نے کافی حکایات و روایات بیان کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔

اس سلسلہ میں مولانا عبدالعظیم انصاریؒ کی تحریر ”تذکرہ علمائے بھوجیاں“ سے استفادہ کیا گیا

ہے اور انہی کے ذرائع روایت پر ایقان و اعتماد کیا گیا ہے۔ حافظ محمد عظیم کی اولاد و احفاد اور دیگر احباب و اصحاب کے ہاں کئی ایسے واقعات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انتہائی متوکل علی اللہ اور مطمئن بذکر اللہ شخص تھے۔ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیوی رغبتوں اور لذتوں سے نا آشنا تھے۔ انہیں بیٹھتے اُٹھتے اور چلتے پھرتے ہوئے بس ایک ہی فکر دامن گیر رہتی کہ ہمارا رب کریم ہم پر راضی ہو جائے اور ہماری اُخروی زندگی بہتر ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کا بھی وعدہ ہے کہ جو بندہ اللہ کا ہو جائے، اللہ تعالیٰ اس کا ہو جاتا ہے اور پھر اس کی تمام ضروریات و احتیاجات کا خود خیال رکھتا ہے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ مرحوم حافظ محمد صاحب آیت الکرسی پڑھ کر بغیر محافظ کے کھیتوں میں مویشی چھوڑ آتے، ان کے مویشی محفوظ رہتے اور کبھی نقصان نہ ہوتا، حالانکہ ابتدا سے ہی میر محمد اور ستوکی کے علاقے میں جرائم پیشہ افراد کی کثرت رہی ہے اور قتل و غارت گری ان لوگوں کا روزمرہ معمول ہے۔

حافظ محمد کے علاوہ بھی اس خاندان کے کئی افراد تقویٰ و صالحیت میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کے بھائی حافظ دوست محمد بھی بڑے خدا ترس بزرگ تھے۔ ان کے شب و روز عبادتِ الہی میں بسر ہوتے۔ بڑے قانع و مطمئن اور صبر و رضا کے پیکر، عجز و انکساری کا نمونہ اور خشیتِ الہی میں محور بننے والے شخص تھے۔ نرم رواں و نرم خواتنے کہ کسی انسان سے اُلجھنا اور جدال و خصام تو دور کی بات ہے، وہ جانور کو بھی نہیں مارتے تھے۔ کاشتکاری کے دوران جب ہل چلاتے تو بیلوں کو چھڑی سے نہیں بلکہ کپڑے سے ہانکتے تھے۔ خصائل حمیدہ سے متصف اس عظیم انسان کا ۱۹۴۰ء میں ارتحال ہوا اور انہیں میر محمد و ستوکی کے درمیان سپردِ خاک کیا گیا۔

حافظ محمد کی اولاد میں دو بیٹے ہوئے: بڑے مولوی محمد یعقوب اور چھوٹے حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی۔ مولوی محمد یعقوب کچھ عرصہ دہلی میں حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی کے قائم کردہ مدرسہ میں زیر تعلیم رہے لیکن وہاں کا نصاب مکمل نہ کر سکے، پھر گاؤں آکر کاشت کاری میں مصروف ہو گئے۔ ان دونوں بھائیوں پر نیکی اور تقویٰ شعاری میں بلاشبہ الولد سرّ لائبہ کی مثال صادق آتی ہے لیکن قد و قامت میں باپ کے ہم پلہ نہیں تھے۔ مولوی محمد یعقوب نے ۱۱ جنوری ۲۰۰۳ء کو اپنے گاؤں میر محمد میں وفات پائی۔ آپ کی اولاد میں حافظ محمد طارق، محمد اسحق اور چھ بیٹیاں شامل ہیں۔

قارئین کرام! یہاں میں حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی کے دیگر حالاتِ زندگی سے قبل ان انٹرویوز کے بعض حصے پیش کرتا ہوں جو میں نے اُن سے اپنے غریب خانے میں ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۶ء کے دوران ریکارڈ کیے:

**سوال:** آپ اپنا نام، والدِ گرامی اور دادا جان کا نام بتائیے؟

**جواب:** محمد یحییٰ عزیز میر محمدی بن حافظ محمد عظیم بن نواب خان بن روشن دین

**سوال:** آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

**جواب:** ۴ شوال ۱۳۴۵ھ بمطابق ۱۲ دسمبر ۱۹۲۷ء کو ضلع لاہور، حال قصور کے معروف گاؤں میر محمد میں پیدا ہوا۔

**سوال:** جب آپ کی شادی ہوئی تو اس وقت آپ کی عمر کتنی تھی؟

**جواب:** عمر تقریباً ۲۵ برس ہوگی، میرے چچا حافظ دوست محمد میرے سر ہیں۔

**سوال:** آپ کو دینی تعلیم حاصل کرنے کا شوق کیسے پیدا ہوا؟

**جواب:** والدین کی شرافت اور نیکی کے اثرات نے میری تربیت میں کافی مدد دی۔ بچپن ہی سے مجھے نیک کام کرنے اور بھلائی والے اعمال میں حصہ لینے کا شوق اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت سے ملا، گھر میں ہی رہتے ہوئے قرآن مجید کی تعلیم کا آغاز اپنے چچا حافظ دوست محمد سے کیا۔

**سوال:** کن کن مدارس میں زیر تعلیم رہے اور بالآخر کس مدرسہ سے فارغ التحصیل ہوئے؟

**جواب:** ابتدائی تعلیم میر محمد میں قائم مدرسہ میں حاصل کی، یہاں حفظ قرآن اور مشکوٰۃ شریف کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد امرتسر چلا گیا اور مدرسہ غزنویہ امرتسر میں زیر تعلیم ہی تھا کہ پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ تقسیم ہند کے بعد کچھ عرصہ یہ سلسلہ رک گیا تھا۔ بعد ازاں پاکستان آ کر اپنے نانا جی کے شاگرد خاص مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجپانی جو گوندلہ ضلع گوجرانوالہ میں تدریس پر مامور تھے، ان سے کچھ عرصہ اکتساب فیض کیا۔ پھر شیخ الحدیث حافظ محمد گوندلوی جو اس وقت ٹاہلی والی مسجد، گوجرانوالہ میں پڑھاتے تھے، ان کے حلقہ تدریس میں شامل ہو کر بخاری شریف و دیگر کتب پڑھ کر فارغ التحصیل ہوا۔

**سوال:** دینی مدارس میں دورانِ تعلیم جن اساتذہ و علما سے استفادہ کیا، ان کے اسمائے گرامی؟

**جواب:** مذکورہ بالا اساتذہ کے علاوہ حافظ دوست محمدؒ، حافظ محمد بھٹویؒ، مولانا نیک محمدؒ، مولانا عبداللہ بھوجیائیؒ، مولانا عبدالرحیم بھوجیائیؒ اور مولانا محمد حسین ہزارویؒ شامل ہیں۔

**سوال:** دینی طلباء زیادہ مدارس کیوں تبدیل کرتے ہیں؟

**جواب:** اس کی میری نظر میں دو وجوہ ہیں: ایک تو ایسے طلباء جو زیادہ محنت کرنا پسند نہیں کرتے، اور دوسری وجہ: کسی لالچ کی خاطر

**سوال:** آپ کتنے بہن بھائی ہیں؟

**جواب:** تین بہنیں اور ایک بھائی (اب صرف ہم شیرگان ہی حیات ہیں)

**سوال:** آپ کے رفقاء مدارس میں سے ایسے افراد جو اس وقت دین حنیف کی تبلیغ پر مامور ہیں؟

**جواب:** شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف مہتمم دارالحدیث راجوال اوکاڑہ، مولانا ابوبکر صدیق سلفی صدر مدرس مسجد نجم الہدایت لاہور، جبکہ حافظ بشیر احمد بھوجیائیؒ اور مولانا محمد یحییٰ شرقپوریؒ ودیگر وفات پا چکے ہیں۔

**سوال:** زندگی کا کوئی ایسا واقعہ جو یاد رہتا ہو؟

**جواب:** بچپن میں ایک دفعہ سکول سے گھر آ رہا تھا کہ ایک بوڑھی عورت کو دیکھا جس نے بھاری گٹھڑی اٹھائی ہوئی تھی۔ ضعیف العمری کی وجہ سے بڑی مشکل سے چل رہی تھی۔

تقریباً چار میل کے فاصلے پر میرا سکول تھا جو میرے گھر سے دور تھا، میرے پوچھنے پر اس بوڑھی خاتون نے بتایا کہ میں نے گاؤں میر محمد جانا ہے۔ میں نے اس کا بوجھ اٹھایا اور اس کے گھر تک پہنچایا۔ اس وقت بوڑھی عورت نے مجھے دعائیں دیں تو میں حیران رہ گیا کیونکہ میری نظر میں وہ اتنا بڑا کا رنامہ نہیں تھا جس کی مجھے اتنی زیادہ دعائیں مل گئیں۔ اس وقت سے میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ خدمتِ خلق اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے، اس لئے ہر دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ علمائے کرام کو میرا مشورہ ہے کہ وہ دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ خدمتِ خلق میں بھی حصہ لیا کریں، کیونکہ ان کی تبلیغ بھی اُس وقت مؤثر ہوگی جب وہ ایک غریب و بے کس شخص کے ساتھ ہمدردی کریں گے، ورنہ ایسے افراد یہ سوچتے ہیں کہ یہ کیسے دعوت دینے والے علما ہیں جنہیں ہمارے دکھ و غم کا احساس ہی نہیں۔

**سوال:** آپ اس سے قبل کن مقامات پر امامت و خطابت کی ذمہ داری ادا کر چکے ہیں؟



**جواب:** اپنے والد گرامی کے جاری کردہ مدرسہ حفظ القرآن میر محمد، مدرسہ ضیاء السنہ راجہ جنگ قصور اور ۱۹۷۳ء سے لے کر اب تک مرکز البدر، ادارہ الاصلاح بوئنگہ بلوچاں ضلع قصور میں دعوت و تبلیغ کے ذریعے دین حنیف کی اشاعت و ترویج میں مصروف کار ہوں۔

**سوال:** قرآن مجید اور صحاح ستہ کے علاوہ کونسی کتب پسندیدہ ہیں؟

**جواب:** قرآن پاک پر ہر تفسیر، سیرت مصطفیٰ ﷺ، نیز امام ابن تیمیہ، امام ابن قیمؒ اور حضرت العلام حافظ عبد اللہ محدث روپڑیؒ کی کتب وغیرہ۔

**سوال:** پاکستان سے فرقہ واریت کا خاتمہ کیسے ممکن ہے؟

**جواب:** اگر یہ فریضہ حکومت پاکستان سرانجام دے تو بہت جلد اثر انداز ہوگا یا امت مسلمہ کے علماء آپس میں اگر یہ فیصلہ کر لیں کہ ہم نے عوام الناس کو کم از کم قرآن پاک کا مکمل ترجمہ اور حدیث شریف کی کوئی نہ کوئی کتاب لازماً پڑھانا ہے تو پھر اس کے نتائج دیکھیں، کیسے آتے ہیں۔ علماء زیادہ زور اپنے مسائل پر دینے کی بجائے قرآن و حدیث کی براہ راست تعلیم پر توجہ دیں، اس طریقہ سے کافی حد تک فرقہ واریت ختم ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ!

**سوال:** آپ اپنے دور کے جن علماء و شیوخ سے بے حد متاثر ہیں؟

**جواب:** شیخ الحدیث مولانا نیک محمدؒ، مولانا محمد عبد اللہ بھوجیائیؒ اور شیخ الحدیث حافظ محمد گوندلویؒ

**سوال:** آپ کی کوئی تصنیف؟

**جواب:** دعوت و تبلیغ کی مصروفیات کی بنا پر اس سلسلہ میں کوئی خاص کام نہیں ہو سکا، البتہ چند تحریریں درج ذیل ہیں جو کتابچوں کی شکل میں شائع ہوئیں:

۱۔ تبلیغ و تربیت کے پانچ اصول ۲۔ تجوید کی پہلی آسان کتاب ۳۔ آسان قاعدہ وغیرہ علاوہ ازیں قرآن کریم کی تلاوت، ترجمہ اور تفسیر ۴۵ کیسٹوں میں ریکارڈ ہونے کے بعد بڑے پیمانے پر پھیلایا گیا ہے۔

**سوال:** بدلتے ہوئے عالمی تناظر کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

**جواب:** حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو اس وقت بعض لوگ دین کو قائم رکھنے کے لئے خصوصی محنت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگوں پر رحم آتا ہے کیوں کہ ایسے افراد میں اخلاص زیادہ ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ جب قربانی دیتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ اس دور کو

بدلتے ہیں۔ موجودہ دور عارضی ہے جو اُمتِ مسلمہ کی قیادت کی غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ یہ منظر بہت جلد بدلنے والا ہے۔

**سوال:** آپ کی پوری زندگی دین کی تبلیغ میں گزری ہے۔ تبلیغ کے لئے کیسی مہارت ضروری ہے؟  
**جواب:** ارشادِ ربانی ہے: اُدْعِ اِلٰی سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ بعض دفعہ ایک کم علم بھی حکمت کے ساتھ بات کرتا ہے تو لوگوں کو متاثر کر دیتا ہے۔ بعض دفعہ ایک بڑا عالم دین حکمت کو نظر انداز کرتا ہے اور موقع کے مطابق بات نہیں کرتا تو اُس کی بات کا اثر نہیں ہوتا، لہذا تبلیغ کے لئے علم سے زیادہ ضروری چیز حکمت ہے۔ تبلیغ دین کے لئے انسانی نفسیات کا ادراک بہت ضروری ہے۔ داعی کے اوصاف میں علم کے ساتھ حکمت اور باعمل ہونا اشد ضروری ہے۔

**سوال:** پاکستان میں آج تک نفاذِ اسلام کیوں نہیں ہو سکا؟  
**جواب:** اس کی دو بڑی وجوہ ہیں۔ ہر صاحبِ اقتدار پارٹی کی تمام تر توجہ اپنے مخالف فریق تک ہی محدود رہتی ہے اور اس کے لئے خلوصِ دل سے کسی نے توجہ ہی نہیں دی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خود اہل اسلام آپس میں گروہ بندی کا شکار ہیں۔

**سوال:** عالم اسلام کے خلاف امریکہ کی بڑھتی ہوئی کاروائیوں کے جواب میں ہمارا کیا کردار ہونا چاہیے؟

**جواب:** بے اتفاقی سے مسلم ممالک نے اپنا بہت نقصان کرا لیا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ آپس کے تمام اختلافات کو بھلا کر اسلام اور اُمتِ مسلمہ کی بھلائی کے لئے متحد ہو کر عالم کفر کے خلاف مشترکہ لائحہ عمل طے کر کے عالم اسلام کے رہنما اٹھ کھڑے ہوں تو دنیا کی کوئی باطل طاقت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

**سوال:** موجودہ سیاست سے اہل حدیث حضرات کو الگ تھلگ ہونا چاہیے یا آوازِ حق بلند کرنے کے لئے اس سے تعلق رکھنا چاہیے؟

**جواب:** تعلق رکھنا تو سیاسی ضرورت بن چکا ہے۔ البتہ تمام دعوتی، تبلیغی اور اصلاحی اُمور کو پس پشت ڈال کر تمام کوششیں اس پر صرف کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس سے قبل ہمیں اپنی صفوں میں اتحاد کی بھی اشد ضرورت ہے۔

**سوال:** مسئلہ کشمیر کا حل کیسے ممکن ہے؟

**جواب:** حکومت پاکستان کا فرض بنتا ہے کہ اس مسئلہ کو سیاسی طور پر حل کرنے کے لئے عالمی سطح پر اسے اٹھائے اور عالمی برادری کی معاونت حاصل کر کے اس کا حل تلاش کرے تاکہ مظلوم کشمیری عوام کو آزادی مل سکے، جنگ و جدل کی موجودہ صورتحال بالکل درست نہیں۔

**سوال:** موجودہ لوگوں کی دین سے دوری کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

**جواب:** دنیاوی آسائش و آرائش کے حصول کے لئے مال کی بے جا حرص نے صالح اعمال اور آخرت کی تیاری کو بالکل بھلا دیا جو کہ مجرمانہ غفلت ہے۔

**سوال:** تمام اہلحدیث جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنے کے لئے کوئی تجویز؟

**جواب:** اس سلسلہ میں دو تجاویز ہیں: تمام جماعتوں کے اراکین مجلس شوریٰ ایک مشترکہ اجلاس منعقد کر کے جسے منتخب کریں، سبھی حضرات اسے اپنا امیر تسلیم کر لیں۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ کم از کم ہر جگہ کوئی تبلیغی و اصلاحی جلسہ وغیرہ کا انعقاد ہو تو اس میں تمام جماعتوں کے اکابرین کو مدعو کیا جائے، اس طرح بھی سب ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں۔

**سوال:** علماء کے ساتھ جو عوام کا رویہ ہے، کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

**جواب:** اپنے علما کی قدر اگر انہوں نے نہ کی جس طرح کرنے کا حق ہے تو پھر اور کون کرے گا، موجودہ رویہ قطعی درست نہیں۔

**سوال:** دین کے موجودہ طالب علم مطالعہ سے بہت کتراتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ درس نظامی کا نصاب پڑھ لیا، کافی ہے۔ کیا یہ طرز عمل درست ہے؟

**جواب:** مطالعہ سے علم میں اضافہ ہوتا ہے، بغیر مطالعہ کے انسان اپنا وقار گم کر بیٹھتا ہے جس قدر انسان کے پاس ذخیرہ قرآن و حدیث ہوگا، اس قدر وہ عالم باعمل اور اس کا خطاب اثر انداز ہوگا۔

**سوال:** کیا عالمی دباؤ میں آکر ہمیں اسرائیل کو تسلیم کر لینا چاہیے؟

**جواب:** یہ امریکی سازش ہے۔ اگر حکومت نے اسرائیل کو تسلیم کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو کچھ اب تک اسرائیل نے مسلم ممالک کے خلاف کیا، وہ درست ہے۔ اس طرح ہم اپنا موقف چھوڑ کر اپنا وقار مزید خراب کریں گے۔

**سوال:** آپ کو دعوتی میدان میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی ہے؟ اور اس راستے میں کون سی مشکلات کا سامنا ہے؟

**جواب:** الحمد للہ پورے پاکستان میں ہمارا کام جاری ہے۔ جماعتیں دور دراز علاقوں تک جاتی ہیں۔ پہاڑی علاقوں کا ہر سال ایک دورہ ہوتا ہے۔ مری، کالا باغ، ایبٹ آباد، نتھیا گلی، کوئٹہ اور اس کے مضافات میں بھی ہماری جماعتیں جاتی ہیں۔ ادھر بڑی تعداد میں ہمارے بھائی موجود ہیں۔ رہی بات اس مشن میں مشکلات کی وہ تو آپ کے علم میں ہے دنیا میں کوئی کام مشکل نہیں، بات صرف سمجھنے اور خلوص سے عمل پیرا ہونے کی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنی مجبوری اور خوشی وغنی کی خاطر سفر گوارا کرتا اور کاروبار بند کر لیتا ہے مگر دین کی تبلیغ کے سلسلہ میں یہ کام ہم گوارا نہیں کرتے۔ حالانکہ دعوت و تبلیغ وہ عظیم مشن ہے جس کی لئے اللہ کریم نے انبیاء کرام کو معبود فرمایا۔ اس دعوتی سلسلہ کو فروغ دینا ہر کلمہ گو کا فرض ہے۔

### خطبات و تقاریر کی روشنی میں آپ کی بعض خصوصیات اور نظریات

① علمائے کرام کی معاشی پریشانی کے خاتمے کیونکر: آپ اپنے اکثر دروس میں فرمایا کرتے تھے کہ ہم اپنے ائمہ و خطباء کی جو خدمت کرتے ہیں، وہ مہنگائی کے اس دور میں بچوں کی تعلیم و تربیت اور دیگر ضروریات زندگی کے لئے ناکافی ہے۔ اگر مسجد کا ہر نمازی اپنے دل میں تہیہ کر لے کہ جو چیز میں اپنے بچوں کے لئے لے جاؤں گا، اس میں سے کچھ حصہ اپنے خطیب کے گھر میں دینا ہے، تو آپ نے لازماً ہر روز کچھ نہ کچھ اپنے کھانے پکانے کا سامان لے جانا ہے۔ ایسی ضرورت خطیب و امام کو بھی ہر روز ہوتی ہے۔ جب ہم ان کی ضروریات زندگی کا کما حقہ احساس یا ان کا ازالہ نہیں کرتے تو وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے کچھ اور ذریعہ تلاش کرتا ہے۔ اس روزگار پر جو وقت صرف ہوتا ہے، اس قدر ہی دینی کام کا نقصان ہوتا ہے۔ جس طرح آپ اپنی صحت کا خیال کرتے ہیں، اس طرح اپنے عالم یا خطیب کے لئے اگر آپ مناسب غذا کا بندوبست کر دیں گے تو اچھی خوراک سے علمی و دینی کام کرنے میں سہولت ہوگی۔

② فضول خرچی سے اجتناب: وضو اور نہانے کے لئے آپ پانی اپنی ضرورت کے مطابق استعمال کرتے۔ عام نمازیوں کی طرح پانی کا ضیاع آپ کو سخت ناپسند تھا۔ ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

سخت گرمی کے موسم میں چھانگاماں گے ضلعی امیر مولانا محمد شفیع اپنے دیگر رفقا کے ہمراہ آپ کے ہاں گئے تو آپ کمرے میں پنکھا بند کر کے ذکر الہی میں مصروف تھے۔ مہمانوں نے پوچھا: کیا بجلی نہیں ہے؟ فرمانے لگے: بجلی تو ہے، اگر آپ کو ضرورت ہے تو چلا لیں۔ مولانا صاحب کہتے ہیں کہ ہم نے پنکھا چلا لیا۔ آپ سے ہم نے پوچھا: کیا آپ نے سخت گرمی کے موسم میں بھی پنکھا نہیں چلایا۔ فرمانے لگے: میں نے سوچا کہ مسجد کے اخراجات میں کچھ کمی واقع ہو جائے، میرے پنکھا نہ چلانے سے کچھ تو بجلی کے بل میں کمی واقع ہوگی۔

③ سخاوت: اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے آپ ہمیشہ صدقہ و خیرات کرتے رہتے۔ بیماری کے دنوں کا واقعہ ہے کہ کوئی ضرورت مند خاتون آپ کے پاس حاضر ہوئی اور اُس نے کچھ تعاون کی درخواست کی تو آپ نے موجود رقم اس سائلہ کو دے دی۔ آپ کے پاس ہی کھڑا آپ کا پوتا کہنے لگا: ابا جان! آپ نے ان کو کتنی رقم دینی تھی۔ آپ خاموش رہے، اُس نے پھر کہا: آپ پھر خاموش رہے۔ بچے نے جب تیسری بار کہا کہ ابا جان آپ نے جو رقم دی ہے، وہ تو بہت زیادہ ہے۔ آپ اُسے تھوڑی رقم دے دیتے، سائل تو آتے رہتے ہیں۔ جواب میں فرمانے لگے: بیٹا تجھے علم نہیں کہ اس بے چاری عورت کا اس رقم سے مہینے بھر کا خرچہ بھی پورا ہو گا یا نہیں؟ وہ رقم پانچ ہزار روپے تھی۔

④ تہجد کی پابندی: مرکزی جمعیت اہلحدیث ضلع قصور کے زیر اہتمام ۱۵ نومبر ۲۰۰۸ء کو جناح ہال پٹوکی میں حضرت حافظ صاحب کی دینی اور جماعتی خدماتِ جلیلہ کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے تعزیتی ریفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس موقع پر آپ کے صاحبزادے حافظ محمد اسماعیل نے آپ کے حوالے سے سامعین کو یہ واقعہ سنایا کہ میری تربیت کے لئے والد محترم حضرت حافظ صاحب نے فرمایا کہ بیٹا میری عمر تقریباً آٹھ، دس سال ہوگی جب مجھے آپ کے دادا جان نے نماز تہجد پڑھنے کی ترغیب دی۔ میں نے اُس وقت سے تا حال نہ صرف اُس کی سعادت حاصل کی بلکہ اُسے قضا بھی نہیں ہونے دیا۔

⑤ خوراک کا کم استعمال اور انکساری: ایک شخص نے آپ کے سامنے یہ بات کہی کہ آپ کی خوراک کچھ بھی نہیں جبکہ حافظ عبدالقادر روپڑیؒ کی خوراک تو اس سے کافی زیادہ تھی۔ فرمانے لگے کہ اگر وہ اتنی خوراک کھاتے تھے تو جو انہوں نے دینی خدمات سرانجام دی ہیں،

میں اُن کا مقابلہ کہاں کر سکتا ہوں؟

⑥ وعدے کی پابندی: وعدے کی پابندی مؤمن کے اوصاف میں شامل ہے، مگر افسوس کہ وعدے کی پاسداری ہمارے معاشرے میں اس قدر نادر ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے اور دین دار لوگ بھی اپنے وعدوں کی پروا نہیں کرتے۔ مگر حافظ صاحب نے جس جگہ پہنچنے کا وعدہ کیا یا آپ سے جو لوگ تقاریر کے وعدے لے کر جاتے، وہ خود بھول جاتے مگر آپ حسب وعدہ دعوت و تبلیغ کے لئے پہنچ جاتے۔ ان کی ڈائری میں شاید ہی کوئی تاریخ خالی ملتی، سال بھر اور زندگی بھر ان کی یہی صورت رہی۔

⑦ شادی خانہ آبادی کے معاملے میں رہنمائی: ہمارے معاشرے میں مناسب رشتوں کا نہ ملنا اس دور کا سنگین مسئلہ بن چکا ہے۔ اس سلسلے میں آپ ہمیشہ تعاون پر آمادہ رہتے اور فریقین کی آسانی کے لئے مطلوبہ معلومات فراہم کرنے میں خصوصی مدد کیا کرتے۔ پھر ایسے شادی بیاہ میں شمولیت سے بھی گریز کرتے تھے تا کہ کل کوئی فریق کسی قسم کا اعتراض نہ کر سکے۔ ازدواجی معاملے طے کروانے کی وجہ یہ تھی کہ اچھے لوگوں کو اچھے رشتہ دار حاصل ہو جائیں اور کوئی شخص غلط لوگوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔

⑧ مرکز البدر میں ماہانہ جمعہ: ماہ رمضان المبارک کا پورا مہینہ آپ مرکز ادارة الاصلاح بونگا بلوچاں میں قیام کرتے اور تمام خطباتِ جمعۃ المبارک کا فریضہ سرانجام دیتے جبکہ باقی گیارہ مہینوں میں صرف ہر چاند کا دوسرا خطبہ یہاں ارشاد فرماتے۔ باقی خطباتِ جمعہ مختلف مقامات پر جا کر دیتے جن کا لوگوں نے چھ ماہ قبل وعدہ لیا ہوتا تھا۔ ادھر مرکز ادارة الاصلاح میں مختلف علمائے کرام کو پابند کر رکھا تھا جو ہر ماہ ایک خطبہ دیتے۔ ان میں راقم الحروف کے والد گرامی شیخ الحدیث مولانا محمد عطاء اللہ حنیف ڈاہروی حفظہ اللہ بھی شامل ہیں۔ آپ نے بھی ایک عرصہ تک حافظ صاحب کی غیر موجودگی میں یہ فریضہ انجام دیا ہے۔

⑨ صفائی اور سادگی میں نمونہ: آپ کا لباس ہمیشہ معمولی قسم کا لیکن صاف ستھرا ہوتا۔ صفائی کا خاص خیال رکھتے، اسی طرح مرکز ادارة الاصلاح کے باورچی خانے سمیت ہر جگہ کو خوب صاف رکھواتے، کسی جگہ کے بارے میں آپ کو کوتاہی کا علم ہو جاتا تو بغیر کسی حیل و حجت یہ فریضہ خود سرانجام دیتے۔ لوگوں نے اکثر دیکھا کہ مرکز الاصلاح کے غسل خانوں کو کئی دفعہ خود

رات کو اٹھ کر صاف کیا کرتے تھے۔ ان کی ساری زندگی سادگی، قناعت، شرافت، مروت اور وضع داری میں گزری۔ انھیں دیکھنے سے اہل اللہ اور علمائے سلف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ یہی وہ خوبی ہے جس کی بنا پر ہر فرد ان کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ آپ نے ہمیشہ لوگوں کو نیکی اور تقویٰ کی تلقین کی۔ ان کی شخصیت میں عجیب جلال و جمال تھا۔ انھیں اپنے بلند منصب کا کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔ اس لیے تو تکبر اور احساس برتری جیسی مہلک بیماریاں ان کے قریب بھی نہ پھٹک سکیں۔

⑤ تلامذہ: آپ کے تلامذہ کی تعداد تو ملک اور بیرون ملک تک پھیلی ہوئی ہے۔ چند معروف شخصیات میں حضرت حافظ محمد عبداللہ شیخوپوری، شیخ الحدیث مولانا عبدالحلیم سابق صدر مدرس جامعہ محمدیہ اوکاڑہ، مولانا قاری عبدالرحیم بونگا بلوچاں، قاری محمد یحییٰ مدرس جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ، قاری محمد یوسف میر محمدی اور استاذ القراء قاری محمد صدیق الحسن حبیب آبادی وغیرہ شامل ہیں۔

⑥ طب سے دلچسپی: ہمارے تقریباً تمام مدارس میں پہلے طب کی بھی کچھ نہ کچھ کتابیں دورانِ تعلیم طلباء کو پڑھائی جاتی تھیں یا پھر بعض اساتذہ کرام جن کو طب سے دلچسپی تھی، وہ اپنے تلامذہ کی بھی اس سلسلہ میں رہنمائی کر دیا کرتے تھے۔ دورانِ تعلیم آپ کے بعض اساتذہ نے اس علم کی طرف آپ کی بھی رہنمائی کی۔ اگرچہ آپ نے حکمت کا باقاعدہ پیشہ شروع نہیں کیا تاہم اپنے دروس میں گاہے بگاہے بعض نسخہ جات بتایا کرتے تھے، یا کوئی پوچھتا تب بھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ مجھے میرے دوست حکیم عبدالغفار قصوری نے دو نسخے حضرت حافظ کے حوالے سے ذکر کئے جو انہوں نے جامع مسجد منیرہ، قصور میں دورانِ درس عوام کو بتائے:

۱) پاگل کتے کے کاٹنے کا علاج: اگر ایسا کتا کسی شخص کو کاٹ لے تو اُس کے علاج کے لئے تخم دھتورہ سیاہ پیس کر خوراک تقریباً ۴ رتی صبح وشام ہمراہ دودھ لیا جائے۔

۲) برائے اسقاط حمل خواتین: اونٹ کے بال لے کر جلا لیں، اس کے برابر گیرولے کر ملا لیں۔ جب دونوں کا سفوف بن جائے تو دوا تیار ہے۔

خوراک: ایک ماشہ صبح، دوپہر، شام کچی لسی کے ہمراہ اور دودھ دیں، اللہ شفا دے گا۔

میرے مطب پر ۵ مئی ۲۰۰۳ء کو جب حافظ صاحب تشریف لائے تو میں نے ان دونوں نسخہ جات کے بارے میں آپ سے پوچھا تو آپ نے ان کی تصدیق فرمائی۔

(۱۲) بیرون ملک سفر: سعودی عرب میں بسلسلہ حج تین بار اور برطانیہ، متحدہ عرب امارات، دبئی اور کویت میں دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں آپ کو جانے کا اتفاق ہوا ہے۔

راقم نے اپنی بساط بھر آپ کی دینی، دعوتی اور جماعتی خدمات کی تھوڑی بہت وضاحت کی ہے۔ آپ کے چاہنے والوں کا وسیع حلقہ ملک اور بیرون ملک موجود ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ بھی حافظ صاحب کے بارے میں اپنے اپنے انداز میں اپنی یادداشتوں کو مرتب کریں گے۔

(۱۳) آپ کی اولاد: آپ کی اولاد میں اکلوتا بیٹا صاحبزادہ حافظ مولانا محمد اسماعیل میر محمدی اور دو بیٹیاں شامل ہیں جبکہ آپ کے اکلوتے بیٹے کے ہاں ایک بیٹا محمد عظیم اور پانچ بیٹیاں ہیں۔

(۱۴) وفات اور نمازِ جنازہ: کچھ عرصہ سے آپ شوگر و دیگر امراض میں صاحبِ فراش تھے۔ علاجِ معالجہ سے صحت میں کبھی کبھی بہتری آ جاتی۔ بالآخر ربِ کریم کے اٹل فیصلے کی گھڑی یکم نومبر ۲۰۰۸ء کو بعد نمازِ عشاء آپ پہنچی جس کے آگے ہر شاہ و گدا کو سرخم تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون!

اگلے روز صبح ۱۱ بجے مرکز البدر، بونگہ بلوچاں میں آپ کی نمازِ جنازہ کی امامت مولانا عتیق اللہ عمر حفظہ اللہ نے کروائی۔ نمازِ جنازہ میں ملک بھر سے شیوخ اہلحدیث، علمائے کرام، قراء عظام، دینی طلبہ اور دینی تنظیموں کے قائدین و کارکنان نے ہزاروں کی تعداد میں شرکت کی۔ جنازے میں ہر آنکھ اشکبار تھی اور آپ کی مغفرت و بلندی درجات کے لئے دعا گو۔

دوسری بار آپ کی نمازِ جنازہ آپ کے آبائی گاؤں میر محمد میں ادا کی گئی۔ وہیں پر آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ آپ کی نمازِ جنازہ کے دونوں مناظر تاریخی حیثیت کے حامل تھے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دینی، تبلیغی اور ملی خدماتِ جلیلہ کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور آپ کو جنتِ فردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!



محبوب عالم فاروقی

اصلاح معاشرہ

## والدین کا مقام و مرتبہ اور موجودہ دور کی بے حسی

رمضان المبارک کی بابرکت اور پُر رحمت ستائیسویں رات کی گھڑیوں میں مسلمان اپنے رب کی رحمتوں، مغفرتوں اور برکتوں کو سمیٹ رہے تھے کہ انہی لمحات میں سرگودھا کے بد بخت نے اپنے باپ کو عید کی خریداری کے لیے پیسے نہ ملنے پر قتل کر دیا۔

اسی طرح عید کے آٹھ روز بعد کراچی کے پوش علاقہ گلبرگ میں اعتراز شاہ نامی شخص نے اپنے والدین، بہن اور بھانجے کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

۲۰۰۸ء کے گزرے ۱۰ ماہ میں کچھ ایسے ہی والدین کے ساتھ بدسلوکی اور قتل کے واقعات سامنے آئے ہیں جو حقیقی طور پر مسلم معاشرے میں عدم برداشت، عدم احترام اور والدین کے ساتھ بدسلوکی کی واضح عکاسی کرتے ہیں، حالانکہ اس سال بھی ۱۱ مئی کو ماؤں کا عالمی دن اور ۱۵ جون کو فادرز ڈے منایا گیا اور پوری دنیا کے میڈیا پر مختلف انداز میں والدین کی اہمیت اور مقام اور مرتبہ پر روشنی ڈالی گئی۔

والدین کے ساتھ بدسلوکی کے چند واقعات درج ذیل ہیں:

جولائی کے پہلے ہفتے میں ایک نہایت ہی افسوسناک خبر آئی کہ پنڈی کے رہائشی، سٹیشنری کاروبار کرنے والے حاجی یوسف نامی بد بخت نے اپنی ماں جیسی عظیم ہستی کے ساتھ ناروا سلوک کی انتہا کر دی کہ چوراسی سالہ فالج زدہ کو ایک بدبودار اور بوسیدہ کمرے میں بند رکھا اور اس کی مناسب دیکھ بھال سے قصداً کنارہ کشی اختیار کی۔ ماں کے جسم کے مختلف حصوں میں کیڑے پڑ گئے۔ یہ خبر پاکستان کے اردو اور انگریزی ٹی وی چینلز پر نشر ہوئی اور بعد میں اخبارات میں بھی چھپی۔

☆ فاضل جامعہ لاہور الاسلامیہ

۱۷ فروری ۲۰۰۸ء کو نوائے وقت میں یہ خبر چھپی کہ منڈی بہاؤ الدین میں بیٹوں نے باپ کو دوسری شادی کرنے پر قتل کر دیا۔ ایسے ہی ہارون آباد کی ایک بد بخت بیٹی عصمت بی بی نے جائیداد کے تنازعہ پر باپ کو ڈنڈے کے وار کر کے قتل کر دیا۔

اسی طرح ۳ فروری ۲۰۰۸ء کو نوائے وقت میں لکھا ہے کہ لاہور میں ایک بیٹے نے جیب خرچ نہ دینے پر ماں کو اس وقت قتل کر دیا جب وہ اس کے لیے روٹی پکا رہی تھی۔ ۲۴ فروری ۲۰۰۸ء فیصل آباد میں بیٹے نے بیوی سے مل کر ماں کو قتل کر دیا۔ اسی طرح ۱۰ جولائی کے دن اخبار میں دو واقعات رپورٹ ہوئے ہیں جن میں سے ایک واقعہ میں بیٹے نے ماں کو اینٹ مار کر مار دیا اور دوسرے میں نافرمان بیٹوں نے جائیداد ہتھیانے کے لیے والدین پر تشدد کیا۔ یہ اور اس طرح کے بے شمار واقعات آئے روز سامنے آتے رہتے ہیں۔ یہ سینکڑوں واقعات ہیں سے چند ایک ہیں جو رپورٹ ہوتے ہیں اور بے شمار ایسے واقعات بھی ہیں جو بوجہ رپورٹ نہیں ہو سکتے۔

والدین انسان کے وجود کا ظاہری سبب ہیں اور ان کے بغیر نہ کوئی خاندان اور نہ ہی کوئی معاشرہ تشکیل پاسکتا ہے۔ والدین مقدس رشتہ ہے اور والدین کے نہ صرف بہت سے اسلام نے حقوق متعین کئے ہیں، ان کو احترام کا مقام دیا ہے اور والدین کی نافرمانی کو سنگین جرم قرار دیا ہے بلکہ اسلام سے پہلے آسمانی مذاہب میں بھی احترام والدین کا تصور موجود ہے۔ ’عہد نامہ عتیق‘ کے باب خروج میں لکھا ہے:

”تو اپنے ماں باپ کو عزت دے تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تجھے دیتا ہے، دراز ہو۔“

(بائبل: خروج: ۲۰)

اسی طرح بائبل والدین کی نافرمانی کو جرم قرار دیتی ہے اور اس پر کڑی سزا تجویز کرتی ہے۔ والدین کی اہمیت کے پیش نظر قرآن و سنت نے والدین کے مسئلہ کو بڑی تفصیل سے بیان کر دیا ہے اور حقوق کی ترتیب متعین کرتے ہوئے والدین کے حقوق کو سرفہرست قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں اسے یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ

وَالْمَسْكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا ﴿٣٦﴾ (النساء: ۳۶)

”اور تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور اہل قربات کے ساتھ بھی اور پاس رہنے والے پڑوسی کے ساتھ اور ہم مجلس کے ساتھ بھی اور مسافر کے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے مالکانہ قبضہ میں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا ہے جو اپنے کو بڑا سمجھتے اور شیخی مارتے ہوں۔“

﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلْ مَا أَنْفَقْتُ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّهِ الدِّينِ وَالْآقَرِبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾  
 ”لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ فرمادیں کہ جو کچھ مال تم کو خرچ کرنا ہو تو ماں باپ کا حق ہے اور قربات داروں کا اور یتیموں کا، محتاجوں اور مسافر کا اور جو نیک کام کریں گے تو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔“ (البقرة: ۲۱۵)

ایک مقام پر والدین کو اُف تک کہنے سے اور جھڑکنے سے منع فرمایا، ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أَفٍ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۖ وَخَفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْنِي صَغِيرًا﴾ (بنی اسرائیل: ۲۳، ۲۴)

”اور تیرے رب نے حکم دیا کہ تم صرف اس کی ہی عبادت کرو اور اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو۔ اگر تیرے پاس ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو کبھی اُف نہ کہو (یعنی ہوں، بھی مت کرنا) اور نہ ہی ان کو جھڑکنا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا اور ان کے سامنے شفقت و محبت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور یوں دعا کرتے رہنا کہ اے پروردگار ان دونوں پر رحمت فرما جیسے انہوں نے مجھ کو بچپن میں پالا اور پرورش کی۔“  
 قرآن نے تمام انبیاء کرام کے پیغام رسالت میں والدین کی برتر حیثیت کو بیان کیا

ہے اور مطلق احکام کی صورت میں بھی والدین کو توحید کے بعد سب سے اونچا درجہ دیا ہے:

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾  
 ”اور وہ زمانہ یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے قول و قرار لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت

مت کرنا اور ماں باپ کی اچھی طرح خدمت کرنا۔“ (البقرہ: ۸۳)

قرآن مجید نے والدین سے حسن سلوک کا نہ صرف حکم الہی بیان کیا ہے بلکہ حسن سلوک کے لیے عقلی دلیل بھی مہیا کی ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمَلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ (الاحقاف: ۱۵)

”اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کی ماں نے اس کو بڑی مشقت کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور بڑی مشقت کے ساتھ اس کو جنا اور اس کو پیٹ میں رکھنا اور دودھ چھڑانا تیس مہینے (میں پورا ہوتا ہے) یہاں تک کہ جب وہ اپنی جوانی کو پہنچ جاتا ہے اور چالیس برس کو پہنچتا ہے تو کہتا ہے: اے میرے پروردگار! مجھ کو اس پر مداومت دیجئے کہ میں آپ کی نعمتوں کا شکر کیا کروں جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں اور میں نیک کام کروں جس سے آپ خوش ہوں اور میری اولاد میں بھی میرے لیے خیر پیدا کر دیجئے، میں آپ کی جناب میں توبہ کرتا ہوں اور میں فرمانبردار ہوں۔“

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفات بیان کرتے ہوئے والدین کے ساتھ ان کے حسن سلوک کا خصوصی ذکر کیا: ﴿وَبِرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا﴾ (مریم: ۱۴)

”اور وہ اپنے والدین کے خدمت گزار تھے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والے نہ تھے۔“ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بچپن میں جو گفتگو کی تھی، اس میں بھی والدہ سے حسن سلوک کا خاص تذکرہ ہے:

﴿وَجَعَلَنِي مُبْرَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ وَ أَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا وَ بَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا﴾ (مریم: ۳۱، ۳۲)

”اور مجھ کو برکت والا بنایا میں جہاں کہیں بھی ہوں اور اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا جب تک میں دنیا میں زندہ رہوں اور اپنی والدہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا ہوں اور مجھ کو سرکش بد بخت نہیں بنایا۔“

## والدین سے حسن سلوک پر احادیث نبویہؐ

”حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کی ناک خاک آلود ہوئی۔ اس کی ناک خاک آلود ہوئی۔ اس کی ناک خاک آلود ہوئی۔ عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کس کی؟ فرمایا جس نے ماں باپ میں سے ایک کو یا دونوں کو بڑھا پے میں پایا اور پھر جنت میں داخل نہ ہوا۔“ (صحیح مسلم: ۶۵۱۱)

”حضرت مغیرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یقیناً اللہ نے تم پر حرام ٹھہرائی ہے ماؤں کی نافرمانی کرنے اور بیٹیوں کو زندہ دفنانے کو حرام ٹھہرایا ہے۔“ (صحیح بخاری: ۵۹۷۵)

”حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ ایک آدمی اپنے والدین پر لعنت بھیجے۔ پوچھا گیا کہ آدمی اپنے والدین کو کیونکر گالی دے سکتا ہے۔ تو جواب دیا کہ ایک شخص کسی آدمی کے والد کو گالی دیتا ہے، جواباً وہ اس کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے۔“ (صحیح بخاری: ۵۹۷۳)

ایک حدیث میں والد کی رضا اور خفگی کو رب کی رضا اور خفگی قرار دیا گیا ہے:

”حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رب کی رضا والد کی رضا میں ہے اور رب کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے۔“ (سنن ترمذی: ۱۸۹۹)

اور نیکیوں میں سے سب سے بڑی نیکی ان کے دوستوں سے تعلق کو قرار دیا گیا ہے جیسا

کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، بلاشبہ نیکیوں میں سب سے بڑی نیکی باپ سے محبت رکھنے والوں سے اس کے چلے جانے کے بعد تعلق رکھنا ہے۔“ (صحیح مسلم: ۶۵۱۴)

قرآن و سنت کے مطالعہ سے والدین کی عظمت و حیثیت اور ان کے مقام و مرتبہ کا پتہ چلتا ہے۔ قرآن پاک میں توحید کے بعد والدین کو اونچا درجہ دیا گیا ہے۔ ایسے ہی حدیث میں بھی اس کی عملی تشریح کی گئی ہے۔

اسلام نے والدین کو جو حقوق دیئے ہیں، ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

② قانونی

① اخلاقی

## اخلاقی حقوق

اخلاقی حقوق میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن کو ادا کر کے ایک اچھا مسلمان ☆ کہلویا جاسکتا ہے، اس میں تین چیزیں شامل ہیں:

- ① حسن سلوک      ② اطاعت      ③ نماز میں دُعا

اطاعت اور حسن سلوک کے بارے میں مذکورہ بالا آیات و احادیث شاہد ہیں۔ اس میں

سے ماں کا درجہ مقدم ہے جیسے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ

”ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون

ہے؟ فرمایا: تیری ماں، پوچھا گیا پھر کون؟ فرمایا: تیری ماں، پوچھا گیا پھر کون؟ فرمایا: تیری

ماں، پوچھا گیا پھر کون؟ فرمایا: تیرا باپ۔“ (صحیح مسلم: ۶۵۰۰)

والدین کی خدمت اور حسن سلوک اور اطاعت جہاد سے بھی اولیٰ ہے:

”حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے کہا: میں جہاد کرنا

چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: تمہارے والدین ہیں؟ جواب ملا، ہاں حیات ہیں۔ آپ نے

فرمایا: ان کی خدمت میں جہاد کرو۔“ (صحیح مسلم: ۶۵۰۴)

ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں ہجرت اور جہاد کے لیے بیعت کرنا چاہتا

ہوں اور اللہ سے اجر کی امید رکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟ اس نے

کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: کیا تو اللہ سے اجر کی امید رکھتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں! آپ نے

فرمایا: اپنے والدین کے پاس جا کر ان کی خدمت کر۔“ (صحیح مسلم: ۶۵۰۷)

حسن سلوک کو حقوق والدین میں نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ آنحضور ﷺ نے حسن

سلوک کے دائرے کو حقیقی والدین سے بڑھا کر رضاعی والدین تک وسیع کیا ہے۔ حدیث میں

☆ والدین کے بعض حقوق کو اخلاقی قرار دے کر اسے اچھا مسلمان بننے سے مشروط کر دینا درست طرزِ فکر نہیں

بلکہ والدین کی نافرمانی کو شریعت نے کبیرہ ترین گناہ قرار دیا ہے، اور مسلم حکومت کا یہ فرض ہے کہ معاشرے

میں گناہوں کی روک تھام کرے، نہ کہ اس حق کو محض اخلاقی قرار دے کر آخرت پر اس کا معاملہ چھوڑ دیا جائے

گا۔ یہی کیفیت والدین سے حسن سلوک کی بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شکایت سامنے آنے پر اولاد کو اپنا رویہ

بدلنے کی عملاً تلقین کی۔ غرض شرعی احکام کو اخلاقی حقوق قرار دے کر اس کو حکومتی کنٹرول سے نکالنا درست

نہیں۔ اسلام میں منکر کی روک تھام تو حکومت سے بڑھ کر ہر مسلمان پر حسب استطاعت فرض ہے۔ حسن مدنی

آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ تشریف فرما تھے کہ ان کی رضاعی والدہ تشریف لائیں تو آپؐ نے چادر بچھا دی اور اس پر اُنہیں بٹھایا۔ (صحیح ابن حبان: ۴۲۱۸)

نماز میں یا ویسے بھی والدین کے لیے دعا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں دیا ہے کہ اپنے پروردگار سے ان کے لیے دعا کرتے رہو:

”اے میرے رب! میرے والدین پر رحم فرما جیسے اُنہوں نے بچپن میں مجھ پر رحم فرمایا (یعنی پالا پوسا)۔“ (بنی اسرائیل: ۲۴)

ایک اور مقام پر قرآن میں والدین کے لئے حضرت ابراہیم کی دعا یوں ذکر ہوئی ہے:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ﴾ (ابراہیم: ۴۱) ”میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما۔“

## قانونی حقوق

ان حقوق سے مراد وہ حقوق ہیں جن کی ادائیگی اولاد پر لازم ہے اور اس میں کوتاہی قانوناً جرم ہے۔ اسلام ان حقوق کے تعین اور ادائیگی کا پورا اہتمام کرتا ہے جو درج ذیل ہیں:

① میراث ② نفقہ ③ والدین کی نافرمانی کی حرمت

① میراث کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ﴾ (النساء: ۱۱)

”اور ماں باپ، دونوں میں سے ہر ایک کے لیے میت کے ترکہ میں سے چھٹا چھٹا حصہ ہے۔“

② نفقہ کے بارے میں قرآن مجید میں ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَأَبْنِ السَّبِيلِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾

”لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کریں؟ آپ بتادیں کہ جو کچھ مال تم کو خرچ کرنا ہو، ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں کا اور باپ کے بچوں کا، محتاجوں کا اور مسافر کا اور جو نیک کام کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔“ (البقرة: ۲۱۵)

حدیث شریف میں حضرت عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ

”ایک شخص نے آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے پاس مال ہے اور صاحب اولاد ہوں اور میرا باپ حاجت مند ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تم بھی اپنے باپ کا

مال ہو اور تمہاری متاع بھی۔“ (ابن ماجہ: ۲۲۹۱، شیخ البانی نے اس کو صحیح کہا ہے) اسی طرح ایک دوسری روایت ہے:

”عمرو بن شعیب روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول ﷺ کے پاس آیا اور کہا: میرا والد میرے مال کا محتاج ہے تو آپؐ نے فرمایا: تم اور تمہارا مال، تمہارے والد کا ہے پھر آپؐ نے فرمایا: تمہاری اولاد تمہاری بہترین کمائی ہے تو تم اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ۔“ (ابن ماجہ: ۲۲۹۰) والدین کمانے کی طاقت نہ رکھتے ہوں تو اولاد پر نان و نفقہ کا انتظام فرض ہے جس میں کوتاہی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مزید تفصیل کیلئے: ’محدث‘ جولائی اور اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۳۶، ۳۱۔

③ والدین کی نافرمانی کے بارے میں ایک روایت اس طرح ہے۔ حضرت ابوذر داء فرماتے ہیں کہ

”میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، والد جنت کے دروازوں کا درمیانی حصہ ہے۔ اگر چاہے تو اس دروازے کو ضائع کر دے یا حفاظت کرے۔“ (سنن ترمذی: ۱۹۰۰)

### خلاصہ

موجودہ دور میں معاشرہ انتشار اور افراتفری کا شکار ہے اور مسلمان اپنی روایات اور اسلامی تعلیمات سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور آئے روز والدین کے ساتھ بدسلوکی، تشدد اور قتل جیسے گھناؤنے جرم کا ارتکاب ایک معمول بن چکا ہے۔ اللہ کی عبادت کے بعد سب سے بڑی نیکی والدین سے اچھا سلوک ہے جسے مسلمان آج فراموش کر چکے ہیں۔ آج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ حقوق العباد کے متعلق اسلام کی تعلیمات کو عام کیا جائے اور خصوصاً والدین کے مقام و مرتبہ کے متعلق جو احکامات ہیں، اسے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا مختلف پروگراموں کے ذریعے عام کرے اور معاشرے کے تمام طبقات اس معاملے میں اہم کردار ادا کریں تاکہ مسلم معاشرہ میں والدین اور بزرگوں کو ان کا جائز مقام مل سکے۔

محدث کا زیر نظر شمارہ نمبر ۳۲۶ نومبر اور دسمبر ۲۰۰۸ء کا مشترکہ ہے، اسلئے ضخامت معمول سے زیادہ ہے نیز اپنے ریکارڈ کی درستی کیلئے ٹائٹل کی دائیں سمت اوپر موجود سلسلہ نمبر سے فائدہ اٹھائیں۔ شکریہ!



☆ محمد شفیق کوکب

موضوعاتی اشاریہ

## ماہنامہ 'محدث' کا ایک سالہ اشاریہ

جنوری تا دسمبر: ۲۰۰۸ء © جلد ۲۰/ عدد ۱۲ تا ۱۳ © شمارہ ۳۱۸ تا ۳۲۶

### حدیث و سنت

۳۹-۵۴	جنوری	ابو جابر دمانوی، ڈاکٹر سر ڈھانکنا اور عمامہ پہننا سنت رسول ﷺ ہے
۲۶-۴۸	مارچ	محمد زبیر، حافظ کیا صحیحین کی صحت پر 'اجماع' ہے؟
۱۲-۲۷	ستمبر	سمیع اللہ فراز، حافظ ذخیرہ حدیث کی تعبیر و تدوین نوکی سازش
۱۸-۳۰	اکتوبر	عمران ایوب، حافظ انکار حدیث کے نئے شبہات کا جائزہ

### غامدیت

۵۵-۶۵	جنوری	محمد رفیق چوہدری جاوید احمد غامدی اور انکار حدیث ①
۶۶-۷۳	فروری	محمد رفیق چوہدری جاوید احمد غامدی اور انکار حدیث ②
۳۹-۲۹	دسمبر	محمد رفیق چوہدری جاوید احمد غامدی اور انکار حدیث ③
۸۸-۷۵	دسمبر	حافظ محمد زبیر کتاب 'غامدی صاحب: علماء کی نظر میں'؛ ایک جائزہ

### اہانتِ رسول ﷺ

۲-۱۹	مارچ	حسن مدنی، حافظ رحمتہ للعالمین ﷺ کی توہین اور ہمارا فرض
۶۱-۷۵	مارچ	حسن مدنی، حافظ احادیث میں توہین رسالت ﷺ کے واقعات
۷۶-۸۰	مارچ	انور غازی توہین آمیز خاکوں کی اشاعت اور یورپ

### علوم قرآن

۲۰-۳۸	جنوری	عبدالفتاح القاضی مصحف شریف؛ ایک تاریخی جائزہ [مترجم: پروفیسر اسلم صدیق] ①
۴۲-۴۰	فروری	عبدالفتاح القاضی مصحف شریف؛ ایک تاریخی جائزہ [مترجم: پروفیسر اسلم صدیق] ②
۲۰-۲۵	مارچ	عبدالفتاح القاضی مصحف شریف؛ ایک تاریخی جائزہ [مترجم: پروفیسر اسلم صدیق] ③
۳۴-۴۹	اپریل	عبدالفتاح القاضی مصحف شریف؛ ایک تاریخی جائزہ [مترجم: پروفیسر اسلم صدیق] ④
۱۲۷-۱۲۸	مئی، جون	محمد سرور قرآن کریم کی آیات کی صحیح تعداد

### فقہ و اجتہاد

۲-۲۳	فروری	حسن مدنی، حافظ اسلام اور جمہوریت میں تصورِ اہلیت
۵۰-۶۴	اپریل	صہیب حسن ڈاکٹر فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کا مسئلہ
۳۶-۵۲	جولائی	سائد بکد اش شیخ کیا والد بیٹے کے مال سے لے سکتا ہے؟ ①

۳۱-۲۷	اکتوبر	کیا والد بیٹے کے مال سے لے سکتا ہے؟ ⑤	سائد بکد اش شیخ
۹-۷	اگست	خادموں کے ساتھ علیحدگی / بے پردگی [مترجم: فاروق احمد حسینی]	محمد بن صالح العثیمین
۲۸-۲	دسمبر	اسلامی نظریاتی کونسل کی حالیہ سفارشات کا جائزہ	حسن مدنی، حافظ

## قانون و فقہ

۵۳-۶۶	جولائی	سزائے موت؛ شریعت اسلامیہ کی نظر میں	حسن مدنی، حافظ
۲-۱۰	جولائی	سزائے موت کے خاتمہ کی مجوزہ ترمیم	حسن مدنی، حافظ
۶۲-۷۷	ستمبر	عدل کا مفہوم، شرعی تصور اور ارتقا ①	عبدالرؤف ظفر ڈاکٹر
۴۸-۷۳	اکتوبر	سیرت نبوی ﷺ اور پاکستان میں عدل ②	عبدالرؤف ظفر ڈاکٹر

## مسئلہ تصویر اور الیکٹرانک میڈیا

۲-۲۴	مئی، جون	تصویر کا شرعی حکم؛ ایک تقابلی جائزہ	حسن مدنی، حافظ
۲۵-۳۲	مئی، جون	عبدالعزیز علوی، حافظ مسئلہ تصویر	عبدالعزیز علوی، حافظ
۳۳-۳۹	مئی، جون	صلاح الدین یوسف حافظ الیکٹرونک میڈیا اور اس کا استعمال	صلاح الدین یوسف حافظ
۴۰-۴۳	مئی، جون	محمد رمضان سلفی، مولانا تصویر کی شرعی حیثیت اور تبلیغ دین	محمد رمضان سلفی
۴۴-۵۸	مئی، جون	محمد شفیق مدنی، مولانا حرمت تصویر کی وجوہات اور دورِ حاضر	محمد شفیق مدنی
۵۹-۷۶	مئی، جون	عبدالرحمن مدنی، حافظ مسئلہ تصویر اور دورِ حاضر	عبدالرحمن مدنی
۷۷-۸۲	مئی، جون	عبدالملک، مولانا تبلیغ دین کے لئے تصویر و ویڈیو کا حکم	عبدالملک، مولانا
۸۳-۹۵	مئی، جون	محمد یوسف خان، مولانا الیکٹرونک میڈیا کا دین کے لئے استعمال	محمد یوسف خان
۹۶-۱۰۲	مئی، جون	متعدد علماء کرام کے مختصر خطابات [رشید میاں تھانوی،	ادارہ محدث
		حافظ صلاح الدین یوسف، محمد سرفراز نعیمی، موقف حزب الاحتاب]	
۳۶-۵۸	اگست	ٹی وی اور تبلیغ اسلام؛ میڈیا وار کا فریب	زاہد صدیق مغل
۵۹-۶۶	اگست	ٹی وی اور تبلیغ اسلام؛ ایک تبصرہ	حسن مدنی، حافظ
۴۹-۴۰	دسمبر	زاہد الراشدی، ابوعمار دینی مقاصد کے لئے الیکٹرونک میڈیا کا استعمال	زاہد الراشدی، ابوعمار
۵۷-۵۰	دسمبر	محمد اقبال کیلانی دینی مقاصد کے لئے ٹی وی پروگراموں میں شرکت	محمد اقبال کیلانی
۶۱-۵۸	دسمبر	عمر فاروق سعیدی جب تصویر کی آفت نہ تھی!	عمر فاروق سعیدی
۶۷-۷۶	اگست	تصویر نمبر پر بعض خطوط: محمد طاہر حکیم، ارشاد الحق اثری	ادارہ
		عبدالرحمن کاف یمن، تبصرہ روزنامہ اُمت، کراچی	

## اسلامی بینکاری کا جائزہ

۱۰-۲۸	اگست	شرعی اور مردودہ کفائل کا تقابلی جائزہ	ذوالفقار علی حافظ
۲۸-۴۶	ستمبر	مردودہ اسلامی بینکاری کی چند خرابیاں	عبدالواحد ڈاکٹر مفتی
۴۷-۶۱	ستمبر	بیع سلم کے اصول اور اسلامی بینک	ذوالفقار علی حافظ

## مواعظ و تذکیر

۲-۲۰	اپریل	اسلام کا پیغام اور مسلم امہ کی حالت زار [مترجم: ملک کامران طاہر]	عبدالعزیز آل شیخ
۲۱-۳۳	اپریل	اللہ کی نظر رحمت سے محروم بد نصیب [مترجم: قاری اختر علی ارشد]	محمد بن عبدالعزیز
۱۰۹-۱۰۲	دسمبر	والدین کا مقام و مرتبہ اور موجودہ دور کی بے حسی	محبوب عالم فاروقی

## اسلام اور مغرب

۶۷-۸۰	جولائی	اعتدال پسندی یا مغرب پرستی؛ چند تاثرات	محمد سرور
۲۹-۳۵	اگست	’دشمن‘ کا نام ہونا چاہئے! [مترجم: سلیم منصور خالد]	ڈینیل پائپس

## تعلیم و تعلم

۲-۱۹	جنوری	’تعلیم‘ کے نام پر حکومتی جبر و استحصال	حسن مدنی حافظ
۱۱-۲۵	جولائی	دینی مدارس میں تعلیم قرآن کا جامع طریقہ	محمد بشیر مولانا
۲۶-۳۵	جولائی	اولیول کی اسلامیات میں فرقہ واریت	سلیم منصور خالد

## تاریخ و سیر

۴۱-۶۵	فروری	شہید کربلا سیدنا حسینؑ کی قربانی	اسماعیل روپڑی حافظ
۱۲۳-۱۲۶	مئی، جون	مغیرہ بن شعبہ کا قبول اسلام	عمر فاروق سعدی
۷۴-۸۰	اکتوبر	ہند بنت عتبہ کے متعلق مبالغہ آمیز قصہ	عبدالجبار سلفی

## تصویر و طنز

۲-۶	اگست	خفیہ ایجنسیاں اور عالمی سیاست	عبدالرشید ارشد
۲-۱۱	ستمبر	مشرق کی رخصتی اور مسائل میں سگلتا پاکستان	حسن مدنی حافظ
۲-۱۷	اکتوبر	ارض وطن میں صبح نو کب طلوع ہوگی؟	محمد عطاء اللہ صدیقی
۱۰۳-۱۲۲	مئی، جون	کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!!	ثریا علوی پروفیسر

## یادِ رفتگان

۶۶-۸۰	جنوری	شیخ الحدیث مولانا عبدالعلیم کوٹلوئی	یحییٰ عزیز ڈاہروی
۱۰۱-۸۹	دسمبر	نمونہ سلف: حافظ یحییٰ عزیز میر محمدی	یحییٰ عزیز ڈاہروی

## فہارس موضوعی

۷۴-۸۰	فروری	’اربعین‘ پر لکھے گئے کتابچے	شاہد حنیف
۴۹-۶۰	مارچ	یونیورسٹیوں میں علوم حدیث کے لکھے گئے مقالات	سمیع الرحمن
۱۱۲-۱۱۰	دسمبر	اشاریہ ماہنامہ ’محدث‘ برائے سال ۲۰۰۸ء	محمد شفیق کوکب

## متفرق

۷۸-۸۰	ستمبر	جامعہ لاہور الاسلامیہ میں حج اور عمرہ کے پانچ انعام	حسن مدنی، حافظ
۷۷-۸۰	اگست	خطبات جمعہ کا نیا مجموعہ ’زاد الخطبیب‘ [از ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد]	کامران طاہر ملک
۷۴-۶۲	دسمبر	ڈاکٹر خالد مسعود (چیرمین نظریاتی کونسل) شخصیت اور افکار و نظریات	سعید احمد جلالپوری

✍ **عناد اور تعصب قوم کے لیے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں**

لیکن تعصبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم اُمت کے لیے رحمت کا باعث ہے۔

✍ **علوم جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں نخل کا درجہ رکھتے ہیں**

لیکن قدیم علوم اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دُقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

✍ **غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اقدار کے منافی ہے**

لیکن دین اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا حیثیت دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

✍ **تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالحِ دینیہ کے خلاف ہے**

لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رواداری برتنا اور قوانین و مسائلِ اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

✍ **آئینِ سیاست سے بیگانہ ہو کر عبادت کے لیے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے**

لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

✍ **جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اوصاف میں داخل ہے**

لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

**اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو**

**ماہِ اُست**

کا مطالعہ فرمائیے، آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزین پائیں گے، ان شاء اللہ!  
کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔